آپ
محمد طفیل

محمد طفیل

ادارۂ فروغِ اُردو، لاہور

بار اوّل	مئی ۱۹۶۷ء
تعداد	ایک ہزار
قیمت	پانچ روپے

محمد طفیل نے نقوش پریس لاہور میں چھپوا کر ادارۂ فروغِ اُردو سے شائع کی۔

"تمہیدیہ"

یہ چار مضمون، میں نے سات برس میں لکھے ہیں۔ ایک لحاظ سے پہلے دو مضمون، میں نے بیس برس سے زائد عرصے میں لکھے ہیں، اِس لیے کہ نیاز صاحب اور جوش صاحب کو میں ایک مدّت سے پڑھ رہا تھا۔

اختر اورینوی اور کرشن چندر پر مضمون، حقِ دوستی ادا کرنے کے لیے لکھے گئے۔ ورنہ اِن شخصیتوں کے بارے میں میرا مطالعہ، دلّی کی زبان میں، جمتول قسم کا نہ تھا۔

پہلے دو مضمونوں کے بارے میں میرا دماغ مطمئن ہے اور دوسرے دو مضمونوں کے بارے میں میرا دل۔ ویسے سچّی بات تو یہ ہے کہ نہ دل مطمئن ہے اور نہ دماغ، اس لیے کہ یہ مضمون مجھ سے زبردستی لکھوائے گئے ہیں جنھیں میں نے محض ضرورتوں کو بہلانے کی خاطر لکھ ڈالا۔ یوں مجھ سے کسی بھی طرح ان مضامین کی تخلیق کا جرم ثابت نہیں ہوتا۔

ترتیب

۱۔ خطبۂ جسارت، ۹

۲۔ نیاز فتحپوری، ۲۳

۳۔ جوش ملیح آبادی، ۵۹

۴۔ اختر اورینوی، ۱۷۷

۵۔ کرشن چندر، ۲۰۷

مصنف

"خطبۂ جسارت"

یہ ایک صدارتی تحریر ہے جسے میں نے خطبۂ صدارت کی بجائے "خطبۂ جسارت" کا نام دیا تھا۔ اس نشست کا موضوع تھا — "کیا ادیب کے لیے صاحب کردار ہونا ضروری ہے؟"

اس "خطبۂ جسارت" کو یہاں بطور دیباچہ پیش کر رہا ہوں۔ اس لیے کہ میرا موضوع بھی تو شخصیتوں کا مطالعہ ہے یوں یہ غیر متعلق سی تحریر بھی کچھ زیادہ غیر متعلق نظر نہیں آتی۔

پہلے آپ مجھے یہ بتائیں کہ میں نے آپ کا کیا قصور کیا تھا؟ اگر قصور نہیں کیا تو پھر مجھے اس مجلس کا صدر کیوں بنایا گیا ہے؟ صدر تو اسے بننا چاہیے جس نے کھا پی لیا ہو، مرنے کے قریب ہو، اس کا جلوس نہ نکالا، صدر بنا دیا کہ آئے اور بیٹھا حاضرین کا منہ تکتا رہے۔

پھر صدر بننے کے لیے دو چار علامتیں ضروری ہوتی ہیں۔ پہلی علامت یہ کہ گھنی گھنی ڈاڑھی ہو، جسامت کے لحاظ سے دو چار آدمیوں کے برابر ایک آدمی ہو۔ سر پر عمامہ اور ہاتھ میں ڈنڈا ہو۔ اگر کوئی صدر یہ شرطیں پوری نہیں کرتا تو وہ کسی مجلس کا صدر ہو گا بھی تو بچے گا نہیں۔ بڑا اوپرا اوپرا لگے گا۔ جیسے اتنے دانشوروں میں ایک یہ خاکسار۔

میرے ذہن میں صدر کا ایک تصوّر یہ بھی ہے کہ وہ لکھنے پڑھنے اور اُٹھنے بیٹھنے کے قابل نہ رہا ہو بے شک اُس نے اپنی جوانی کے زمانے میں لکھنے لکھانے کی جھک ماری ہو۔ مگر اب اس سے ایک لفظ نہ لکھا جاتا ہو۔ بلاشبہ ایسے لوگ صدر بننے کے مستحق ہیں ــــ اگر آپ حضرات نے مجھ میں بھی ایسی باتیں پائی ہوں

تو پھر مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں۔

صدر کا پہلا کمال تو یہ ہوتا ہے کہ وہ آپ کو اصل موضوع کی طرف آنے ہی نہ دے اور ادھر اُدھر کی باتیں کر کے آپ کا وقت ضائع کر دے۔ یہ نکتہ مجھے ایک دفعہ ایک بہت بڑے صدر نے بتایا تھا۔ ہر چند کہ میں ابھی اس فن سے ناآشنا ہوں مگر یہ جو ایک پتے کی بات میرے کانوں میں پڑ چکی ہے۔ اس سے کیوں نہ زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاؤں۔

اچھا تو صاحبان! ایک بار میں علی گڑھ گیا تھا۔ یونیورسٹی کی طرف سے بڑی شاندار ضیافت کا اہتمام کیا گیا۔ بے شمار باتونی قسم کے طالب علم اور رنگا رنگ قسم کے پروفیسر موجود تھے۔ میں نے کھانا کھایا۔ آخری لقمہ منہ میں ہی ہوگا کہ پروفیسر اور لڑکے ایک ساتھ مجھ پر پل پڑے اور سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

معاً ایک صاحب جو بڑے منتظم پرداز ثابت ہوئے، تجویز کرتے ہیں کہ میں اس میٹنگ کی صدارت کے لیے طفیل صاحب کا نام پیش کرتا ہوں۔ اُدھر تالیاں پٹیں ادھر ہوائیاں اُڑ گئیں۔

پھر تو صاحب سوال پر سوال اس طرح چھوٹنے لگے جس طرح برین گن سے گولیاں چھوٹتی ہیں۔

غرض علی گڑھ کے ان منچلوں نے میرا وہی حال کیا جو ایک بار علی گڑھ کے اسٹیشن پہ مولانا آزاد کا کیا تھا۔ بس فرق اتنا تھا کہ مولانا کے مقابل صرف لڑکے تھے

میرے مقابل ان اب عملوں کے ساتھ پروفیسر بھی تھے۔

یہ ذکر میں نے اس لیے چھیڑا ہے کہ ایک تو آپ کو اصل موضوع سے ہٹائے رکھوں تاکہ میرے صدارتی فن پر دیگر صدروں کی طرح آنچ نہ آئے۔ دوسرے اس لیے کہ آپ کو بھی یقین ہو جائے کہ یہ حضرت اور کچھ ہوں یا نہ ہوں مگر صدارت کے لیے تو ہرگز موزوں نہیں۔

جی تو یہ چاہتا ہے کہ اصل موضوع پر آؤں ہی نہیں مگر بعض سادہ لوح مجھ سے یہ بھی توقع رکھتے ہوں گے کہ میں اصل موضوع پر بھی کچھ کہوں گا۔ اچھا تو حضرات! آپ کا آج کا موضوع ہے:

"کیا ادیب کے لیے صاحب کردار ہونا ضروری ہے؟"

واہ وا موضوع کیا عمدہ ہے، لطف آگیا۔

مگر سوال یہ ہے کہ صاحب کردار ہونا نہ صرف ادیب کے لیے ضروری ہے بلکہ چور، اچکے، لفنگے، لفنگے کے لیے بھی ضروری ہے؟

اچھا تو پہلے یہ طے کر لیں کہ ادیب کون ہے اور اس کی پہچان کیا ہے؟ کیا جس کے دو مضمون چھپ چکے ہوں وہ ادیب ہے؟ — کیا جس نے دو افسانے لکھ لیے ہوں، وہ ادیب ہے؟ کیا جس نے دو غزلیں فرما دی ہوں وہ ادیب ہے؟

جب تک یہ فیصلہ نہ ہو گا کہ آخر ادیب ہم کسے مانیں اس وقت تک بات آگے کیسے چلے۔ بات چلے نہ چلے۔ پہلے آپ ایک لطیفہ سن لیں۔

ایک بڑے مشہور افسانہ نگار کو، جن کے کئی ایک افسانوی مجموعے چھپ چکے ہیں میں نے انھیں لکھا کہ "آپ ادیب نہیں ہیں، بس ایک لکھنے والے ہیں۔"

جب میرا خط ان صاحب تک پہنچا تو وہ آگ بگولا ہو گئے۔ جواب میں لکھا۔

"میں پندرہ بیس برس سے افسانے لکھ رہا ہوں۔ کوئی بھی افسانوی تذکرہ میرے نام کے بغیر مکمل نہیں۔ مگر آپ ہیں کہ مجھے ادیب ہی ماننے سے انکار کیے دے رہے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ بس میں ایک لکھنے والا ہوں۔ لکھنے والا تو وہ بھی ہوا جو پہلی جماعت میں پڑھتا ہے اور تختی پر الف بے لکھتا ہے۔"

میں نے جس افسانہ نگار کو اس مضمون کا خط لکھا تھا۔ ان سے میری خاصی بے تکلفی تھی۔ اس لیے میں نے انھیں جواباً پھر چھیڑا۔ "جناب پہلی جماعت کا بچہ تختی پر الف بے اس لیے لکھتا ہے کہ وہ لکھنا سیکھ جائے۔ جو افسانہ نگار افسانے لکھتا ہے وہ بھی اپنے آپ کو ادب کی پہلی جماعت کا طالب علم سمجھے ___ اور ادیب بننے کے لیے اسے ادب کی کئی جماعتیں پاس کرنا ہوں گی۔

یہ تو خیر کچھ لطیفہ تھا اور کچھ حقیقت۔ ویسے میرا یہ خیال ضرور ہے کہ ہر لکھنے والا ادیب جیسے بڑے لفظ کا حق دار نہیں ہے۔

اس بحث کو یہیں چھوڑیں کہ کون ادیب ہے اور کون نہیں۔ فی الحال یہ تصور کر لیجے کہ آٹھ دس تازہ واردانِ ادب ایک کیفے میں بیٹھے ہیں۔ پانی کا فل سیٹ اور چائے کا ہاف سیٹ سامنے پڑا ہے اور بحث زوروں پر ہے۔

"حالی؟"

"اجی چھوڑیے۔۔۔ری ایکشنری شاعر تھا۔ اس میں دھرا کیا ہے؟"

"جرأت؟"

"چھوڑو بھی یار۔ بڑا بدمعاش ہے وہ۔"

"غالب؟"

"ہاں اس میں کچھ کچھ جان نظر آتی ہے۔ مگر تھا وہ بھی مسخرا۔"

"اقبال؟"

"چھوڑیے صاحب چھوڑیے۔ دنیا کہاں کی کہاں نکل گئی۔ مگر اس ظالم نے ہمیں چودہ سو برس پرانا ہی درس دیا۔"

یہ خیالات تازہ واردانِ ادب کے ہیں۔ باستثنائے چند۔ اب حالات دیکھیے۔ یہ "پیغمبرانِ ادب" کافی ہاؤس اور ٹی ہاؤس کا دروازہ کھلتے ہی ڈٹ جاتے ہیں اور اس وقت لوٹتے ہیں جب بیرا میز پر گیلا کپڑا پھیر کر یہ کہتا ہے "صاحب! ہوٹل بند ہونے والا ہے۔"

میں نے اپنے کئی ملنے والوں سے پوچھا "بھئی آپ لوگ سارا سارا دن ہوٹلوں میں بیٹھ کر کیا کرتے ہیں؟"

"ہمیں وہاں سے لکھنے کے لیے مواد ملتا ہے۔"

"گذر اوقات کیسے ہوتی ہے؟"

"کوئی نہ کوئی قدر دان آجاتا ہے اور چائے کا بل ادا کر جاتا ہے۔"

"چائے کے بل کی بات نہیں، آپ کے تو بیوی بچے بھی ہیں۔"

"جی ہاں! ان کا بھی اللہ مالک ہے۔"

نئے لکھنے والوں نے یہ ضروری سمجھ لیا ہے کہ صاحبِ کردار ہونا اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنا، ادب کی موت کے مترادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً سارے لکھنے والے اپنے آپ کو عام لوگوں سے کچھ الگ سا بنا لیتے ہیں۔ میں نے انھیں بے قاعدگی میں یکتا، بے ضابطگی میں فرد، ذمہ داریوں سے بے نیاز اور اپنے آپ سے بے خبر پایا ہے۔ کاش! آج کا ادیب اتنا صاحبِ کردار نہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔

آیئے! اب ذرا پرانے ادیبوں کی محفلوں میں جا بیٹھیں جن کے دم سے ادب میں تازگی ہے۔

غالب شراب پیتے تھے، جوا کھیلتے تھے، کسی ڈومنی سے عشق کرتے تھے مگر ان میں بہت سی خوبیاں بھی تھیں۔ بذلہ سنج تھے، خوددار تھے، حساس تھے مگر اس وقت ہمیں ان کی خوبیوں سے بحث نہیں۔

غالب سے بھی پہلے ایک صاحب میر ہوئے ہیں۔ وہ بھی بڑے حضرت تھے۔ "مدظلہ" خود فرماتے ہیں:

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

آپ یہ نہ سوچیں کہ اس زمانہ میں شعرا کا خیالی محبوب مؤنث نہیں مذکر تھا ــــ اس لیے میر نے لونڈے کی طرف توجہ فرمائی ہوگی۔ بلکہ یاد رکھیں کہ یہ میر کا آبائی مرض تھا۔ ذکر میر میں جو میر کی خود نوشت سوانح ہے۔ انھوں نے اپنے والد ماجد کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے کہ وہ بڑے متقی اور پرہیز گار تھے مگر خوبرو لونڈا دیکھتے تو ــ بلکہ ایک ضعیف سی روایت یہ بھی ہے کہ ان کے خوف سے نوخیزوں نے ڈاڑھیاں رکھنی شروع کر دی تھیں۔

کردار کا ایک اور نمونہ بھی دیکھیں۔ معرکہ انشا اور مصحفی کا ہے مگر توم ڈالتے ہیں گھر والیوں کو بھی۔ انشا کے ایما پر ایک جلوس نکالا گیا تھا جس میں ایک شخص ہاتھی پر سوار تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک گڑیا اور گڈا تھا اور وہ دونوں کو ایک دوسرے پر مارتا تھا اور یہ شعر پڑھتا تھا:

رنگ بنا لایا ہے آج یہ چرخِ کہن
لڑتے ہوتے آئے ہیں مصحفی و مصحفن

دیکھ لیا آپ نے مصحفی کے ساتھ مصحفن کی بھی کس طرح گت بنی۔ بالکل اسی طرح جس طرح سودا نے ضاحک کی بیوی کی بنائی تھی ؎

ضاحک کی اہلیہ نے ڈھول اپنے گھر بجایا
لگا گا کے رات ساری ہمسایوں کو جگایا

منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے دو ایک شاعرات کے بھی شعر نقل کردوں تو اچھا ہے۔

یہ تو آپ کے علم میں ہوگا کہ پہلے محبوب کے لیے فعلِ مذکر ہی کا استعمال ہوتا تھا۔ چنانچہ محترمہ حجاب صاحبہ فرماتی ہیں ؎

کہوں گا دادرِ محشر کے آگے محشر میں
کہ عمر بھر اسی کافر کو میں نے پیار کیا

محترمہ شہرم صاحبہ فرماتی ہیں :

خوب سا پیار کروں گا بخدا میں تم کو
ہاتھ آجاؤ گے پیارے جو کبھی رات کے وقت

پہلے آپ نے اپنے شاعروں کا حال سُنا تھا اور یہ شاعرات کے جذبات کا حال ہے۔ ممکن ہے آپ میں سے کوئی یہ کہہ دے کہ یہ شعر شاعروں ہی نے عورتوں کے نام سے کہے ہیں۔ ایسے ایک دو واقعات ضرور ہیں مگر ہم یہ کیوں نہیں مانتے کہ عورتیں بھی شعر کہہ سکتی ہیں جیسا کہ آج بھی کہہ رہی ہیں۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ دُنیا کی تمام برائیاں مردوں ہی کے سر رہیں۔ آخر کیوں ؟ ذرا خواتین کو بھی آگے آنے دیجئے۔ مردوں کے شانہ بشانہ چلنے دیجئے۔

ادب میں ایسی مثالیں بھی ہیں کہ کہنے والا خود تو بڑا متقی اور پرہیزگار تھا، مگر ان کی شاعری اور تحریروں سے ان کی شرافت کا زیادہ پتہ نہیں چلتا۔ مثلاً ریاض خیر آبادی بڑے دین دار بزرگ تھے مگر وہ زندگی بھر شراب شراب کہتے رہے۔ نظیر اکبر آبادی کا بیشتر کلام ایسا ہے کہ وہ کسی شریفانہ مجلس میں نہیں پڑھا جا سکتا مگر وہ

خود اتنے بڑے بدمعاش نہ تھے۔ امیر مینائی، جن کے زہد و تقویٰ اور پارسائی کی دھوم تھی۔ وہ بھی ایسے ایسے شعر کہتے تھے کہ زبان انھیں بے تکلف ہی ادا کر سکے تو کرے۔ مثلاً ؎

بوسہ لپٹ کے لے ہی لیا میں نے زہر میں
ہاں ہاں سنی کسی کی نہ اُن کی نہیں نہیں

باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی
بھیجنا ہیں ایک کمسن کے لیے

اگر ایسے شعر داغ کہتے تو ٹھیک تھا۔ اس لیے کہ ان کی شاعری بھی جوانی کا خمار ہے اور ان کی زندگی بھی۔

"خطبۂ جسارت" خواہ مخواہ طویل ہو رہا ہے۔ میں بھی بور ہو رہا ہوں۔ آپ بھی اکتا چکے ہوں گے۔ قصہ کوتاہ، اگر ان ادبا و شعراء کی فہرست بنائی جائے جو صاحب کردار تھے تو تعداد سینکڑے سے چھوڑ، مشکل دہائیوں تک پہنچے گی۔ کاش ہزاروں ادیب صاحبِ کردار ہوتے اور چند ادیب بے کردار --- مگر ایسا کلجگ کہاں ممکن تھا!

بات یہ ہے کہ صاحبِ کردار اور بے کردار لوگ ہر شعبے میں پائے جاتے ہیں۔ ڈاکٹروں میں بھی، وکیلوں میں بھی، استادوں میں بھی، افسروں میں بھی --- اور ادیب بھی تو عام انسانوں ہی کی طرح ہوتے ہیں۔ فرشتے نہیں ہوتے۔

ادب کے طالب علم بصیرت کی آنکھیں رکھتے ہیں وہ دو ڈھائی سو سالہ ادبی تاریخ میں جھانک کر دیکھ لیں کہ بڑے ادب کی ترویج و ترقی میں کردار نے کوئی بڑا رول ادا نہیں کیا۔

کردار کی چھوٹی بڑی کمزوریاں کس بڑے ادیب میں نہ تھیں۔ دُور کیوں جائیں میرے اور آپ کے علامہ اقبال میں بھی کتنی ایک انسانی کمزوریاں تھیں مگر ان کا جو پیغام ہے وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔

جی چاہے تو مولانا شبلی کو بھی جھانک کر دیکھ لیں۔ سیرت النبیؐ کے مصنف ہیں یہ!

ذرا مولانا حالی کی طرف تو دیکھیں۔ وہ غریب ادیبوں کی بھری محفل میں اکیلے ہیں — اور کتنے اُداس!

HaSnain Sialvi

نیاز صاحب[1]

فرمان صاحب آپ بھی فتح پور کے رہنے والے ہیں۔ وہی بات ہو گئی نا کہ یک نہ شُد دو شُد!

جب آپ کا پہلا خط آیا تھا۔ اگر میں کچھ بھی نیاز صاحب پر لکھ سکتا تو اسی وقت لکھ بھیجتا۔ یاد دہانیوں کی نوبت نہ آتی۔ مگر میں کیا کروں۔ نیاز صاحب کے بارے میں میری معلومات ناقص نہ سہی، محدود ضرور ہیں۔ اتنی مختصر یادوں کے سہارے مجھ سے اتنی بڑی شخصیت کا "جھٹکا" نہ کیا جائے۔

میرا کوئی عذر بھی تو کسی کام نہ آیا۔ آپ نے مطلوبہ کتابیں تک بھجوا دیں۔

---

[1] یہ مضمون "نگار" کے نیاز نمبر کے لیے لکھا گیا تھا جس کا مطالبہ فرمان فتحپوری صاحب کی طرف سے تھا۔

اب سوائے اس کے کہ کچھ زیادتی میں بھی نیاز صاحب کے ساتھ کروں اور کیا چارہ کار باقی رہا۔ سارا گناہ ثواب آپ کی گردن پر۔

میں نقاد نہیں ہوں کہ جہاں چاہوں ڈنڈی ماردوں۔ میرا موضوع شخصیتوں کا مطالعہ ہے۔ جس میں جھوٹ نہیں چلتا بلکہ کنواری لڑکیوں کی طرح اپنی لاجوں آپ مرنا پڑتا ہے۔

بھائی! میں نیاز صاحب کی تحریر کا تو عاشق ہوں مگر شخصیت کا نہیں۔ بالکل نہیں۔ اس لیے اب بھی سوچ لیجئے کہ مجھ سے کچھ لکھوانا مناسب بھی ہوگا یا نہیں؟ پھر میرا عجز یہ بھی ہے کہ مجھے لفظی بینترے بازی آتی نہیں۔ بھائی بھی نہیں اس لیے دو ٹوک انداز میں یہی کہنا پڑے گا کہ شخصی اعتبار سے نیاز صاحب ایسے اور بھی بہت سے لوگ مل جائیں گے مگر نیاز بہ حیثیت ادیب نیاز ہی ہیں — حریف کوئی نہیں۔

ہاں صاحب یاد آیا۔ ان کی شخصیت کے اس پہلو پر ایمان رکھتا ہوں کہ یہ تھوڑی بہت انفرادیت کے ساتھ اپنی جگہ بڑی دلچسپ اور منگا مہ خیز شخصیت کے مالک ہیں۔

۲

میں نے نیاز صاحب کا نام اس وقت سنا تھا۔ جب خود بچہ تھا مگر آج مجھے

باتیں کرنی پڑیں گی۔ ایک بوڑھے بچے کے بارے میں، لوگ بوڑھے اور بچے کو ایک برابر سمجھتے ہیں۔ مگر نیاز ایسے بوڑھوں میں نہیں جنھیں بچہ کہا جا سکے۔ کلیہ غلط ہو گیا۔

بچپن ہی میں یہ سنا تھا کہ لکھنؤ میں ایک کافر نیاز نامی ہے جو ایسی باتیں لکھتا ہے جو اسلام کا بدترین دشمن بھی نہیں لکھ سکتا۔ اس وقت ان کے خلاف جلسے ہوتے تھے۔ تقریریں ہوتی تھیں۔ ایک ہنگامہ بپا تھا۔ مولانا سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی نیاز صاحب کو کافر اور ملحد قرار دے رہے تھے۔ کیا خبر تھی کہ جب آپ کی کافر اور ملحد سے ملاقات ہوگی تو وہ کئی عابدوں سے بہتر انسان ثابت ہوگا۔

میری کوئی شامت تھوڑی آئی ہے جو میں یہ کہوں کہ علماء بلا وجہ ہی برہم تھے بات یہ ہے کہ نیاز صاحب کی شرارت آمیز باتوں نے جو انھیں گرمایا تو وہ آپے میں نہ رہے۔ دوسرے ہمارے علماء مذہب کے معاملے میں عقل کو دخل دینے بھی تو نہیں دیتے۔ بس اتنی سی غلطی تھی جو نیاز صاحب سے ہوئی۔ چونکہ شرارت اور اُپج سے نیاز صاحب کا خمیر اُٹھا ہے۔ اس لیے بے مہار بھی چلے:

ایک طرف یہ کہتے ہو کہ اسلام نے بُت پرستی کو مٹایا اور دوسری طرف اس میں مُبتلا ہو۔ بُت خواہ وہ خدا ہی کا کیوں نہ ہو بُت ہے اور توڑے جانے کے قابل ــــ اور خدا خواہ وہ کوئی بُت ہی کیوں نہ ہو قابلِ پرستش ہے۔ اگر تم اس نازک فرق کو نہیں سمجھ سکتے تو جاؤ اٹھو وضو کر کے نماز پڑھو۔ تمہارا بُت تُم سے خفا نہ ہو جائے ــــ میں بھی

جاتا ہوں۔ آئینہ سامنے رکھ کر اپنے خدا کو پوجوں گا۔[1]

مذہب نام ہے صرف کورانہ اور جاہلانہ انقیاد و اطاعت کا اس لیے اس کا وجود، خواہ وہ ضروری ہو یا غیر ضروری، مفید ہو یا غیر مفید، صرف اسی طرح قائم رہ سکتا ہے کہ وہ اسی طرح جہل و لاعلمی کی دُنیا میں رہے۔ علم کے میدان میں اس کی تگ و دو حد درجہ نامعقول جسارت ہے۔ کیونکہ یہیں آکر سب سے پہلے اس کے پائے لنگ کا حال لوگوں پر کُھلتا ہے اور وہ مضحکہ خیز چیز بن جاتا ہے۔[2]

مثالیں اور بھی بہت سی دی جا سکتی ہیں مگر چھوڑیئے — میں خود اپنے آپ کو کچھ معتبر قسم کا مسلمان نہیں سمجھتا۔ اس کے باوجود، مجھے بھی تو نیاز صاحب کافر ہی سے نظر آتے ہیں۔ واضح رہے کہ کافر ہونا اور کافر نظر آنا، دو نوں مختلف صورتیں ہیں۔

کفر و اسلام کی اُس جنگ کے بعد، جس میں سرد فریق نیاز اور گرم فریق علماء تھے۔ اُنھوں نے ایک اور محاذ کھول دیا۔ شیعہ اور سُنیّوں کے درمیان مسئلۂ خلافت کا، نچلا بیٹھنا ان کے بس کی بات ہی نہیں۔ اس بحث کا آغاز "ہر نام" سے ہوتا ہے

---

[1] سالنامہ نگار، جنوری ۱۹۶۰ء۔

[2] من و یزداں حصہ دوم صفحہ ۳۹۳

جو قرآن اور حدیث کے حوالوں سے باتیں کرتے ہوئے نہیں تھکتے اور حوالے
دیتے ہیں اُن کتابوں کے، جن میں تقریب التہذیب، استیعاب، اسد الغابہ،
تاریخ کبیر، تاریخ کامل، تاریخ ابوالفداء، لباب التاویل، معالم التنزیل،
مواہب لدنیہ، تاریخ خمیس، صواعق محرقہ، خصائص، ریاض النضرہ، طبقات
کبریٰ، تاریخ الخلفاء، مدارج النبوۃ، جامع البیان، تفسیر کبیر، موطا، سیرۃ
ابن ہشام، روض الانف وغیرہ ہیں۔ یہ ساری کتابیں رجال، سیر، تاریخ اور
تفسیر کی مشہور کتابیں ہیں۔ اس سے پہلے میں نے ان میں سے چند ہی کے نام
سُنے تھے۔ چہ جائیکہ پڑھا ہو۔ جانچا ہو۔ مگر حیرت ہے ایک غیر مسلم پر جو نہ صرف
ان کتابوں کو پڑھتا ہے بلکہ ان میں ڈوب کر اپنے مطلب کے حوالے بھی نکال
لاتا ہے۔ جہاں تک میرا ذہن کام کرتا ہے وہ تو یہ ہے کہ ہر نام کے پردے میں
خود نیاز صاحب ہی ہوں گے۔ اس لیے کہ بی جمالو والا کام یہ خوب جانتے ہیں۔

ربع صدی سے پہلے ہی کا یہ بھی ذکر ہے کہ اُنھوں نے ایک نوشتہ خط
کی صورت میں چھوڑا جس میں تمام علماء سے یہ پوچھا کہ ایک مسلمان، جو فاسق و فاجر
ہے اور ہر لحاظ سے بُرا انسان ہے اور اس کے برعکس ایک غیر مسلم جو ہر طرح سے
بہتر انسان ہے اور دُنیا کی کوئی بُرائی اس میں نہیں ـــ ان دونوں میں سے جنّت
کا حق دار کون ہوگا؟

بہت سے علماء نے اپنی رائے گول مول سی دی۔ کچھ نے کنّی کترائی۔ بہتوں

نے یہ لکھا کہ مسلمان ہی جنت کا حق دار ہوگا۔ خواہ وہ کتنا ہی بُرا کیوں نہ ہو — جواب میں انھوں نے بڑے تند و تیز مضامین لکھے۔ خوب "ہلّا گُلّا" ہُوا۔ ان کے کہنے کا جو کچھ بھی لبِ لباب تھا۔ وہ یہ کچھ تھا:

"آپ لاکھ سمجھائیں یہ بات میری سمجھ میں کبھی نہ آئے گی کہ خدا صرف مُسلمانوں کا ہے اور سوا ان کے سب کو جہنم میں پھینک دے گا۔ ظہورِ اسلام سے لے کر اس وقت تک زیادہ سے زیادہ دو چار ارب مُسلمان پیدا ہوئے ہوں گے اور ان کے مقابلے میں ہزار گنا زیادہ اور مذاہب کے لوگ، پھر کیا کوئی ذی عقل باور کر سکتا ہے کہ خدا ایک کو جنت دے اور ہزار کو دوزخ میں جلائے اس کو اتنے جہنمی پیدا کرنے کی آخر ضرورت ہی کیا تھی اور اتنی مخلوق کو جن میں نہ جانے کتنی حسین عورتیں ہوں گی آگ میں ڈال کر تڑپانے سے خدا کی کونسی مسرّت وابستہ ہے!

آپ کے پاس اس کا ایک ہی جواب ہے کہ اس کی مرضی"
اور میرے پاس بھی اس کے خلاف ایک ہی احتجاج ہے ؎

یا رب زسیلِ حادثہ طوفاں رسیدہ باد
بُت خانۂ کہ خانقہش نام کردہ اند

ابھی کوئی سال سوا سال ہوا ہوگا۔ اُنھوں نے ایک اشغلہ اور چھوڑا کہ احمدی ہی اصل میں

مسلمان ہیں ۔ باقی سب نام کے مسلمان ہیں ۔ نیاز صاحب خود نیاز محمد خان تو ہیں مگر مسلمان کچھ ایسے ویسے ہی نظر آتے ہیں ۔ جب معاملہ یوں ہو تو پھر انھیں کیوں رہ رہ کر اسلام اور مذہب کی فکر دامن گیر ہوتی ہے ۔ بات یوں ذہن میں آوے ہے کہ نہ تو انھیں دوا اپنی قسم کے اسلام سے کوئی دلچسپی ہے ، نہ شیعوں سے ، نہ سنیوں سے اور نہ ہی غریب احمدیوں سے ، یہ تو کوئی نہ کوئی اچنبھے کی ایسی بات کرنی چاہتے ہیں جس سے لوگوں کے کان کھڑے ہوں ۔۔ اور انھیں اپنی علمیت کے جوہر دکھانے کا موقع ملے ۔ یہ تو صرف اپنی قابلیت اور علمیت کی وجہ سے سب کو نالائق ثابت کرنا چاہتے ہیں ۔۔ انا بھی کیا بُری بلا ہے ۔

جہاں تک میرا خیال ہے نیاز صاحب اندر سے بڑے مذہبی آدمی ہیں ۔ اُنھوں نے اب تک مذہب کے بارے میں جو کچھ اور جتنا کچھ لکھا ۔ اُس میں صرف جھوٹی مذہبیت کو جھنجھوڑا ۔ بنے ہوئے خدائی فوجداروں کے مذہبی پندار کو آئینہ دکھایا ۔ نیاز صاحب کوئی کافر وافر نہیں ہیں بلکہ معاملہ صرف اتنا نظر آتا ہے :

کافر ہوا ہیں دین کے آداب دیکھ کر

بہرحال یہ چھیڑ چھاڑ ، انھیں بڑی مہنگی پڑی ۔ ساری خدائی ایک طرف تھی اور یہ اکیلے ایک طرف ، اپنی عقل اور علم کا علَم لیے ۔ مولویوں سے بغاوت ، رسوائی سے بغاوت کے نام سے تعبیر ہوئی اور پھر بات خدا سے بغاوت تک پہنچا دی گئی ۔

یہ جو مذہب دشمن بنے ۔ وہ صرف خدا کے نمائندوں سے بدظن ہو کر ۔ یہی وجہ

ہے کہ انھوں نے مولویوں کے خلاف "نقاب اٹھ جانے کے بعد" قسم کے تقدس توڑ
افسلنے لکھے۔ ضد میں آکر اعتدال کی حدود یہ بھی پھاند گئے اور ہمارے علما بھی،
حالانکہ ضرورت تھی کر ذرا پچکار کے اس "مسلمان کو کافر بنا لیا جانا" ــــ اس ذہنی
ورزش کا اور کوئی فائدہ ہوا کہ نہیں مگر حقیقی نیاز ضرور سامنے آگیا اور اس کے ساتھ
عقل کو بھی مذہب کے معاملات میں ساتھ رکھ لینے کی بنیاد پڑی۔

میں نے جو کہا ہے کہ نیاز صاحب اندر سے مذہبی آدمی ہیں تو اس کی کچھ وجوہ
بھی ہیں۔ ابھی ایک کتاب "خلافتِ معاویہ و یزید" نکلی۔ بہت سے نامور علماء نے
اس کی بڑی تعریف کی۔ حالانکہ اس میں بڑی اوٹ پٹانگ باتیں درج ہیں۔ اس
میں یزید کو خلیفۂ برحق کہا گیا ہے۔ ایسے کہ جیسے ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ تھے۔
پھر یزید کو امیر المومنین علیہ السلام اور رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ لکھ کر مسلمانوں کے جذبات
سے کھیلا گیا۔ مطلب یہ کہ سخت دل آزار قسم کی کتاب ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق ایسے ادیب
اور مولانا عبدالماجد ایسے عالم نے بھی اس کتاب کی تعریف کی مگر نیاز نے جو کافر
ہیں۔ بڑا سخت ریویو لکھا اور اس کے مندرجات کو مطعون گردانا۔

مجھے یا کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم کسی کو کافر اور کسی کو مسلمان کہیں جب کہ
آج تک یہی پتہ نہ چلا ہو کہ مسلمان کی تعریف کیا ہے۔ ۱۹۵۳ء میں احمدی ایجی ٹیشن
کے خلاف جو انکوائری کمیٹی بیٹھی تھی۔ اُس نے تمام علماء سے سوال کیا تھا کہ پہلے
یہ بتائیے کہ مسلمان کی تعریف کیا ہے۔ وہاں مختلف عقائد کے علماء جمع تھے۔

سب ایک دوسرے کا منہ دیکھ کر رہ گئے۔ اس لیے کہ مسلمانوں میں بھی تو کئی عقیدوں کے لوگ ہیں جیسے شیعی، خارجی، معتزلی، وہابی، احمدی، بہائی، نیچری وغیرہ۔ ہمارا مولوی تو دوسرے عقیدے والے کو بھٹ سے کافر کہہ دیتا ہے۔ مسلمان ہوتے ہوئے بھی ہم مولویوں کی نظر میں مسلمان نہیں ہیں۔ دیکھا جائے تو مختلف عقیدے رکھنے والے بھی سارے کے سارے مسلمان ہیں۔ اس لیے کہ جو خدا کی وحدانیت اور رسولؐ کی رسالت پر ایمان رکھتا ہے وہ کافر کیسے ہو جاتا ہے۔

اگر کوئی رسولؐ کی عظمت کے بارے میں، اور اسلام کی برتری کے بارے میں نیاز صاحب کی تحریروں میں ڈھونڈھنا چاہتا ہے تو وہ قطعاً مایوس نہ ہوگا، مگر کتنے ہیں جنھوں نے نیاز صاحب کے اس پہلو پر غور کیا ہوگا۔ ایک آدھ شہادت کے بعد میں اس باب کو نہ چھیڑوں گا۔ اس لیے کہ میں کوئی "مفتیٔ وقت" ہوں کہ کسی کو مسلمان ہونے کے اور کسی کو مسلمان نہ ہونے کے پرمٹ بانٹتا پھروں — نیاز صاحب اپنے عقائد کے بارے میں خود کہتے ہیں:

"غضب خدا کا۔ میں سو بار کہہ چکا ہوں کہ خدا کی عظمت وجبروت اور اس کی قوت وقدرت کا اس طرح قائل ہوں کہ شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ ہزار بار لکھ چکا ہوں کہ رسولؐ کی صداقت وبلندیٔ فطرت پر جس طرح ایمان میں لایا ہوں شاید ہی کوئی ایمان لایا ہو۔ لیکن باوجود اس اقرار کے بھی میں کافر ہوں۔ ملحد ہوں۔ مرتد ہوں پھر

اگر اس اقرار و عقیدہ کا نام کفر و الحاد ہے تو ع

نازم بہ کفرِ خویش کہ با ایمان برابر ست [1]

نیاز صاحب کے عقائد کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ مذہب کے معاملے میں سر سید کے ہمنوا نظر آتے ہیں۔ سر سید بھی اپنے وقت میں کافر اور ملحد تھے۔ یہ بھی ہیں۔ اس لیے کہ دونوں کا جُرم یہ ہے کہ انھوں نے مذہب کو عقلی انداز میں سمجھنے کی کوشش کی ۔۔ آج لاکھوں کروڑوں مُسلمان ہیں مگر اُن میں کوئی سر سید نظر نہیں آتا۔ اسی طرح کل بھی لاکھوں کروڑوں مُسلمان ہوں گے مگر اُن میں کوئی نیاز نہ ہوگا۔

۳

نیاز صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۴۴ء میں ہوئی تھی۔ اُس وقت کی کوئی بات میرے ذہن میں نہیں۔ سوائے اس کے کہ میں انھیں ایک بڑا ادیب سمجھ کر ان سے ملنے چلا گیا تھا۔ دوبارہ ۱۹۴۶ء میں ملا تھا۔ دورانِ گفتگو کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی چلا۔ نیاز صاحب نے اس وقت تک زیادہ تر اپنی کتابیں خود ہی چھاپی تھیں۔ میں نے یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ اپنی کوئی کتاب کسی دوسرے ادارے کو نہ دیں گے

---

[1] من و یزداں۔ ص ۸۹

پوچھ لیا:" اگر آپ اپنی دو چار کتابیں ادارۂ فروغِ اُردو کو بھی چھاپنے کے لیے دیں تو کرم ہو۔" خلافِ توقع اُنھوں نے بہت اچھا کہہ دیا۔ میں نے بھی موقع کی نزاکت اور اُن کی وقتی شرافت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دریافت کیا۔ "آپ کے پاس کیا کچھ اشاعت کے لیے موجود ہے؟"

اس کے جواب میں اُنھوں نے میرے سامنے ایک رجسٹر رکھ دیا جس میں اُن کے اُن تمام مضامین کی فہرست تھی جو نگار میں تو چھپ چکے تھے مگر کتابی صورت میں نہیں آئے تھے۔ وہ کوئی دو سو کے قریب مضامین تھے۔ ان میں سے کچھ میرے پڑھے ہوئے تھے۔ کچھ کے معیار اور ان کی اہمیت کا اندازہ ان کے موضوعات سے لگایا۔ پچیس تیس مضامین پر نشان لگا دیئے کہ یہ مضامین دے دیئے جائیں۔ اُنھوں نے نشان زدہ مضامین دیکھ کر حامی بھر لی۔ ڈیڑھ ہزار روپیہ معاوضہ طے ہوا۔

نقول کے بعد جب وہ مضامین میرے پاس پہنچے تو اُن میں ایک مضمون بھی وہ نہ تھا جن پر میں نے نشان لگائے تھے یا جو ہمیں مطلوب تھے۔ مجھے بڑا غصہ آیا۔ شکایت کا خط لکھا۔ اُنھوں نے خوش کرنے کے لیے مجھے چند مضامین اور بطور رشوت بھیجے — بہرحال میں اپنے ادارہ کی طرف سے اصلی نیاز کو پیش نہ کر سکا بعد میں وہ مضامین من ویزداں (حصۂ اوّل) کے نام سے خود نیاز صاحب نے چھاپے۔

یہ وہی مضامین تھے جن پر ایک زمانے میں ہنگامہ بپا تھا اور "دین کا سچا درد

رکھنے والے" نیاز صاحب کو قتل کر دینے کی فکر میں تھے۔ میں نے ایسے مضامین کی اشاعت کے بارے میں کبھی سوچا تھا۔ یہ مسئلہ آج بھی میرے لیے غور طلب ہے مگر یہ مسئلہ غور طلب نہیں کہ میں اگر نیاز صاحب کی ذہانت اور ان کی تحریر کا قائل ہوا تھا تو انہی مضامین سے، عقل اور تحریر کا اتنا بانکپن، یکجا کم ہی کبھی ہوا ہو گا۔

نیاز صاحب کی تحریر کی بات آ نکلی ہے تو میری دو چار باتیں اور بھی سن لیں۔ ــــ یہ مضمون لکھنے کے لیے میں نے نیاز صاحب کی کتابوں کو پھر سے پڑھنا شروع کر دیا۔ اس لیے کہ میرا خیال ہے نیاز صاحب اپنی تحریروں میں بالکل ننگے ہیں۔ دل و دماغ سے یہاں دونوں اعتبارات سے!

شروع شروع میں بعض خوبصورت فقروں اور جملوں پہ نشان بھی لگائے مگر میں یہ کام کہاں تک کرتا۔ ہر سطر ہر فقرہ اپنی طرف متوجہ کر لیتا۔ بعد میں تو ان کی تحریروں کے بہاؤ میں ایسا بہا کہ کچھ ہوش نہ رہا۔ پھر نہ تو کوئی نشان ہی لگا سکا اور نہ کہیں اٹک سکا۔ بہتا ہی چلا گیا۔ یہ بھی پتہ نہ چلا کہ صبح کے تین بج گئے ــــ تین بجے ہوں اور سماں یہ ہو ــــ ٹھنڈی یخ رات، الوٹ سناٹا، دور کتے کے بھونکنے کی آواز، کسی کسی گھر میں سرسراہٹ، کہیں اکا دکا دھند میں لپٹی ہوئی آواز ــــ کبھی آپ نے نیاز کی تحریریں ایسے ماحول میں پڑھی ہیں؟ اگر پڑھی ہوں گی تو ان پہ الہام کا گمان بھی ہوا ہو گا ــــ میں ایسے سمے "ایک شاعر کا انجام" پڑھ رہا تھا۔ کیا بتاؤں، میں نے کیا کچھ نہ پایا۔

نیاز صاحب نے جو کچھ بھی امتیاز حاصل کیا۔ وہ اپنے قلم کے سحر سے حاصل کیا۔ لکھنے کے لیے کسی اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ باتیں بھی کرتے جاتے ہیں لکھتے بھی جاتے ہیں۔ گلوری مُنہ میں ہوگی۔ غُوں غُوں کرکے باتوں میں ساتھ دیں گے۔ ضرورت پڑی تو پیک نگل کر بولیں گے۔ "یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ میں کام میں مشغول ہوں"۔ حافظہ بلا کا پایا ہے۔ ہر چیز، ہر کتاب ان کے ذہن میں منتقل ہوجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بڑے بڑے کام صرف چند دنوں میں کرڈالے۔ "گہوارۂ تمدن" ایسی کتاب صرف پندرہ دنوں میں ذہن سے کاغذ پر منتقل ہوگئی تھی۔

ان کے ہاں آمد ہی آمد ہے۔ آورد نام کو نہیں۔ الفاظ واقعی ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ یہ کمال میں نے صرف انیسؔ، جوشؔ اور نیازؔ میں دیکھا باقی سب کے ہاں کاریگری ہے۔ وہ چاہے محمد حسین آزاد ہوں چاہے کوئی اور۔ ہاں ابوالکلام کا نام بھی لیا جاسکتا ہے مگر انھوں نے تو آورد کو آمد بنایا۔ اس لیے میں نے دانستہ انھیں اس گروہ میں شامل نہیں کیا۔ یوں تو نیاز ابوالکلام سے متاثر ہیں۔ نیاز ہی کیا۔ پورا دَور متاثر ہے۔ ابوالکلام نے تحریر کی باگیں خطابت کے ہاتھ میں دے دیں مگر نیاز نے ایسا نہیں کیا۔ اُنھوں نے اپنا رنگ جمانے کے لیے تحریر کی آبرو کی قیمت اپنی ریاضت سے ادا کی۔

میرے ایک دوست ہیں۔ اُنھوں نے نیاز صاحب کے بارے میں کہا تھا

کہ یہ بڑے خود غرض ہیں۔ میں اس وقت اپنے اُس دوست کو جھٹلا کر خود شرمندہ نہیں ہونا چاہتا۔ نہ مجھے نیاز صاحب نے اس پر مامور کیا ہے کہ میں ان کی طرف سے صفائی پیش کرتا پھروں۔ میں تو اس باب میں خاموش رہنا چاہتا ہوں۔ اس لیے کہ یہ بات سخن گسترانہ سہی مگر یکسر غلط بھی نہیں ——— ویسے خود غرض تو ہر آدمی ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنی ہی بھلائی چاہتا ہے۔ یہ شاید اتنے خود غرض نہیں کہ دوسروں کو نقصان پہنچا کر اپنی بھلائی چاہتے ہوں۔ مگر ایک کلیہ یہ بھی ہے کہ دوسرے کا نقصان ہوئے بغیر اپنا فائدہ ہوتا ہی نہیں۔ اگر معاملہ یُوں بھی ہو اور یُوں بھی تو خاکسار حدِ ادب والی بات کو بھولنا نہیں چاہتا۔

نیاز صاحب کے مُنہ سے شکریے کا لفظ ذرا کم ہی نکلتا ہے۔ یہ ہر معاملے میں دوسرے کی مہربانی کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ میں نے سُنا ہے کہ ایک صاحب نے نگار کے بڑے خریدار بنائے۔ حیدرآباد دکن سے بڑے بڑے عطیے دلوائے۔ ہزاروں روپے، مگر نیاز صاحب نے ان میں سے کسی ایک کا بھی شکریہ ادا نہ کیا۔ حالانکہ بھاگ دوڑ کرنے والے صاحب کہتے ہی رہے کہ بھئی جن لوگوں نے اتنی اتنی بڑی رقمیں دی ہیں۔ ان کا لفظی شکریہ تو ادا کر دو مگر انھوں نے صاف انکار کر دیا ۔ "یہ مجھ سے نہ ہوگا" ——— اس لیے کہ ان لوگوں نے یہ سب کچھ اس لیے کیا ہے کہ نظام کے ہاں تمھاری کمان چڑھی ہوئی ہے۔ یہ جو کچھ ہوا نظام کی وجہ سے ہوا۔ اس لیے نہ میں شکریہ ادا کروں۔ نہ تم کرو۔

اسی طرح ان کی[1] انا کا ایک واقعہ وہ عرضداشت بھی ہے جو اُنھوں نے بیگم صاحبہ بھوپال کے نام لکھی تھی۔ سن پندرہ سولہ کا واقعہ ہوگا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ان کی گیتانجلی کا ترجمہ شائع ہو چکا تھا۔ "شاعر کا انجام" اور "جذبات بھاشا" چھپ چکی تھیں۔ بھوپال میں ان کے کچھ ایسے قدردان پیدا ہوئے جنھوں نے انھیں بھوپال آنے کی دعوت بھی دی اور بات بھی بیگم صاحبہ تک پہنچائی۔ بیگم صاحبہ نے وعدہ کر لیا کہ نیاز صاحب کا ہر طرح سے خیال رکھا جائے گا —— نیاز صاحب بھوپال پہنچے تو فوری طور پر کچھ نہ ہوا مجبوراً انھیں محکمۂ اوقاف میں کام کرنا پڑا۔ جب دو برس یونہی گزر گئے تو دوستوں کے تقاضے سے اُنھوں نے ایک عرضداشت بیگم صاحبہ کو بھیجی۔ وہ عرضداشت یہ ہے :

عرض داشت نیاز

زمن سپاس تو آید ہمیں کہ نالانم — زخندہ ات چہ نوا بردہ ام کہ گریانم

نگاہ مہر کہ بر من فگندۂ ببینم — سحاب لطف کہ بر من فشردۂ دانم

دلے ز آرزوئے خود ہنوز منفعلم — ز اقتضائے کمال خودش پشیمانم

بدست من سر دامان خود رسیدن دہ — وگرنہ چاک شدن خواہدش گریبانم

عجب نباشد اگر می زنی بد ستارت — بجائے طرۂ کہ من گوہرے ز عمانم

ببر مرا بہ شمامت کہ مشکم از تاتار — بکش مرا بہ برت تیغے از صفاہانم

[1] میں انا کو مونث ہی لکھوں گا۔

مرا به افسر و دیہیم خود بده جاے — که من به تاب و صفا لعلے از بدخشانم

مرا به پرسش حسان و شیخ شیرازی — که نغمه عرب و طوطئے ز ایرانم

مرا به وعدهٔ لطفے چو شاد فرمودی — نه زیبدت که تماشا کنی پریشانم

جہانگنی که تو امروز بیشتر سازی — ہماں امید که دی ساختی رگِ جانم

تماشا کن و قدرم شناس و کارم ده — که باشد از نظرِ عدل و نظم شادانم

وگرنه ده خبر از نامرادیم که زنم

به سنگِ سخت قفا قلبِ نالہ سامانم

ملاحظہ فرمائی آپ نے عرض داشت؟ دیکھیے درخواست میں بھی ان کی انا کس مقام
پر ہے۔ بیگم پر طنز، اور اپنی حد درجہ بڑائی کا احساس۔ یہ طنطنہ آپ کو اس قلندر کے
علاوہ اور کس کے ہاں ملے گا؟ بیگم صاحبہ کا بھی ظرف دیکھیے کہ انھوں نے ایسی عرضداشت
پر بھی ان کا (۱۹۱۸ء میں) کوئی ڈیڑھ سو دو سو روپیے ماہوار کا وظیفہ مقرر کر دیا
تاکہ "بزرگوار" آزادانہ تصنیف و تالیف کا کام کر سکیں۔

عملی زندگی میں یہ ریاضی یا اقلیدس ہیں جس طرح ایک عدد دوسرے عدد کو
"جمع تفریق" ہوئے بغیر کوئی نقصان نہیں پہنچاتا۔ اسی طرح یہ بھی اپنے ملنے والوں کو
"جمع تفریق" ہوئے بغیر کوئی نقصان نہیں پہنچاتے۔

اور گوتم بدھ کی طرح، ان کے ہاں ایک خاص قسم کا ذہنی سکون بھی ملتا ہے
ربودگی اور بھاری بھرکم پن کے ساتھ، ایک خاص قسم کا استغنا۔

"تکلف نام کو نہیں، چھوٹے پندار سے یارانہ نہیں۔ سوچنے کا انداز نرالا، کم علموں کو پڑھا لکھا اور پڑھے لکھوں کو بے علم اور جاہل سمجھ لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات اپنی تحریروں میں سب کو حیرانی کی سرحد پر لا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے جو جی میں آئے لکھ ڈالیے۔ کون پوچھتا ہے۔ پھر ہر وقت ان کے ذہن میں "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" بھی گونجتا رہتا ہے۔ لکھنے لکھانے کی حد تک ان کا کلیہ یہ ہے کہ جو صاحبِ علم ہوگا وہ تو ہر چیز پڑھے گا نہیں۔ جو بے علم ہوگا۔ اُس کے لیے ہر تحریر میں سب کچھ ہوتا ہے۔

مذہبی معاملہ ہو یا علمی و ادبی، انھیں اپنے جوہر دکھائے بغیر چین نہیں پڑتا۔ چاہے کسی بھی معاملے میں سو سو کیڑے ڈلوا لیجیے۔ ہما شما کا تو ذکر ہی کیا، انھوں نے خدا کی کتاب (قرآن) تک کو کہہ دیا کہ یہ خدا کا کلام نہیں بلکہ اس کتاب کو اگر رسولؐ کی کتاب مانیں تو اس سے رسولؐ کی عظمت اور بڑھے گی۔ مطلب یہ کہ بات دُنیا سے الگ جو کرنی ہوئی۔

اُنھوں نے اگر کسی کے خلاف لکھا ہے تو وہ سب ایسے ہیں جن کا ادب میں اونچا مقام ہے۔ چھوٹے موٹے ادیبوں کو تو مُنہ ہی نہیں لگاتے۔ پہلے بھی میں نے عرض کیا ہے کہ مبتدیوں کی بے جا حد تک حوصلہ افزائی کر جائیں گے۔ اس خیال سے نہیں کہ وہ ایسے توصیفی کلمات کے مستحق ہوتے ہیں بلکہ اس خیال سے کہ ان کی مخفی صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقع تو ملے اور ــــ اور ــــ بعد میں دیکھا جائے گا۔

اُنھوں نے بڑے بڑے اساتذہ کو وہ وہ اصلاحیں دی ہیں کہ بے چارے نکو بن کر رہ گئے۔ کوئی خوش قسمت ہی ہوگا جو ان کے قلم کی زد سے بچا ہو۔ جہاں تک شعر کے سمجھنے کا تعلق ہے خوب سمجھتے ہیں۔ شعروں کا آپریشن بھی خوب کرتے ہیں مگر اس آپریشن میں بعض اوقات شعر کو ذبح بھی کر ڈالتے ہیں۔ ساری دنیا ان کی اصلاحوں کو جو چاہے درجہ دے مگر میری ناچیز رائے میں اصلاحیں بڑی بھونڈی دیتے ہیں۔ ابتدائی دور میں ایسا نہیں کرتے تھے۔ چونکہ عمر کے ساتھ ساتھ اُستادی شان بھی بڑھتی ہے۔ اس لیے ذرا سوچنے کا مقام ہے کہ یہ قصور ان کا ہوا یا یہ بھی ان کی عمر کے پلّے باندھنا پڑے گا؟

ان کا شعروں پر عمل جراحی، کچھ مکتبی تعلیم ہی کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ اُستادوں کے سوالات شاید اب تک ان کے ذہن سے نہیں نکلے۔ جیسے شعر کی نثر کرو، ترکیب نحوی کرو، تقطیع کرو، دعوے کے ساتھ ثبوت پیش کرو۔ وغیرہ وغیرہ وغیرہ۔ اُنہی مکتبی باتوں نے ان کا پیچھا اب تک نہیں چھوڑا۔ لہٰذا یہ ادیبوں اور شاعروں کا پیچھا کیوں چھوڑیں ــــ یہ بھی شعر کی نثر کرائیں گے۔ دعوے کے ساتھ ثبوت مانگیں گے ــــ قصہ مختصر نیاز صاحب کی اصلاحیں کچھ ایسی ہوتی ہیں ــــ ــــ خشکہ باگندہ بہ دزہ، اگرچہ گندہ نمرایجاد بندہ ــــ ایسی زبا دنیوں اور ایسی خوش فعلیوں کے باوجود، دشمن کا بھی دل چاہتا ہوگا کہ ان کا قلم چوم لے۔

ایک بات اور بھی سوچنے والی ہے کہ اتنی شعری سوجھ بوجھ کے بعد، یہ خود

جو شعر کہتے ہیں۔ وہ بڑے بھُس بھُسے ہوتے ہیں علم اور قابلیت نے بھی اچھے شعر کم ہی لوگوں سے کہلوائے ہیں۔ دیکھیے ابوالکلام بھی اس وادی میں صفا مارے گئے۔

نیاز صاحب نے فارسی تو اپنے والد ماجد سے پڑھی اور عربی عرب محمد طیب اور مولوی صدیق حسن غازی پوری سے، انہی بزرگوں کا یہ سب کیا دھرا ہے جو نیاز کی شکل میں ہمارے سامنے آیا۔ اب تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ فارسی اپنے والد سے بھی زیادہ جانتے ہوں اور عربی اپنے اُستادوں سے بھی زیادہ، یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات ان کے فقرے سمجھ میں نہیں آتے۔ بظاہر اُردو کے ہوتے ہیں مگر ٹوہ لگائی جائے تو ان میں سے کچھ فارسی کے نکلتے ہیں اور کچھ عربی کے اور بیڑا اُن غریبوں کا ہو جاتا ہے جو اپنی طرف سے اُردو پڑھنا چاہتے ہیں لے

نیاز صاحب غالباً پہلے شخص ہیں جنھوں نے قلم کو آمدنی کا ذریعہ بنایا جب تک یہ بھوپال میں تھے اُس وقت تک ان کا اپنا کوئی اشاعتی ادارہ نہ تھا مگر یہ مضامین اُس وقت بھی معاوضتہً دیتے تھے۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں یہ باقاعدہ قسم کے مضمون نگار تھے۔ تمدن، اسوۂ حسنہ، صوفی اور خطیب وغیرہ رسائل میں ان کے مضامین نکلتے

مثلاً :-

لے میرے کو ائف سے استبعاد حقیقی ہے۔ آج کم و بیش ۳۰ دن ہوئے جب مجھ سے اس نامساعد مناکحت کی تقریب میں قبول کیا۔ اس کی آنکھیں یوں تو اور بھی مترحم اور عاشقانہ کیف کا محل نظر آئیں۔ میرے لیے وجہ نکوہش ہے۔ اس کی نگاہوں کی عادت مستمرہ ہو گی۔

"شاعر کا انجام"

بھی تھے اور چلتے بھی تھے۔

اگر یہ ملازم ساٹھ روپوں کے تھے تو ان کا خرچ کوئی پونے دو سو کا تھا۔ مکان کا کرایہ، نوکر کی تنخواہ، ساٹھ روپوں میں دیتے تھے۔ باقی علیش قلم کی آمدنی سے کرتے تھے۔ اس کے بعد جب اُنھوں نے باقاعدہ کتابوں کی نشر و اشاعت کا سلسلہ چلایا اور نگار کو آسمانِ صحافت تک پہنچایا تو لاکھوں کمائے۔ خوب خوب کتابیں لکھیں جو بکیں بھی خوب خوب، نگار کے بھی وہ وہ نمبر نکلے کہ اُن پر اضافہ تقریباً ناممکن ہے۔

یُوں تو نگار کے قلمی معاونین میں، ہمیشہ بڑے لکھنے والے ہی رہے مگر ان سب کی موجودگی میں بھی، نیاز صاحب کی تحریر کی بات ہی اور ہوتی تھی اور جی چاہتا تھا کہ کاش سارا رسالہ خود نیاز صاحب کی تحریروں ہی سے مزیّن ہوتا۔ چنانچہ انھوں نے ایسا بھی کر دکھایا۔ سارے کا سارا نمبر خود "کھ کر" پبلش کر دیا۔ پڑھنے والے نہال ہو گئے۔ یہ مرتبہ بھی نیاز صاحب کے سوا، کسی اور کو نصیب نہ ہُوا۔

نیاز صاحب، مومن کے بڑے مدّاح ہیں۔ جو کوئی بھی مومن کا زیادہ مدّاح ہو گا۔ وہ لازمی طور پر اس کے ہم عصر غالب کا زیادہ طرف دار نہ ہو گا۔ یہی حال کچھ نیاز صاحب کا بھی ہے۔ مگر یہ اپنے مضامین میں جتنے شعر، غالب کے کوٹ کرتے ہیں۔ اتنے مومن کے نہیں کرتے۔ اختیاط صرف اتنی کرتے ہیں کہ غالب کے اُردو شعروں کی بجائے، فارسی کے شعر، اپنی نثر میں سجاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ غالب

کو فارسی کا شاعر اور مومن کو اُردو کا شاعر مانتے ہیں۔ یہ فلسفے ہی فلسفے کو یا صرف تصوف ہی تصوّف کو غزل نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کا جو تصوّر ان کے ہاں ہے وہ انھیں مومن ہی میں ملتا ہے۔ غالب میں نسبتاً کم ملتا ہے۔ بظاہر یہ بات چانوچل جانے والی ہے۔ مگر یہ کچھ زیادہ غلط نہیں۔

اس لحاظ سے بھی نیاز صاحب کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو یہ عملی زندگی میں بھی مومن ہی نظر آتے ہیں۔ مومن ہی کی طرح عورت سے لطف اندوز ہوتے ہیں، مومن ہی کی طرح عورت کی پرستش کرتے ہیں اور مومن ہی کی طرح کا، ان کے ہاں بھی تصورِ عفّت ملتا ہے۔ کچھ عجیب سی رندی میں عفّت اور عفّت میں رندی کا سا انداز ہے۔

مومن اپنی مثنویات میں جس طرح نظر آتے ہیں۔ نیاز ویسے ہی اپنے خطوط میں نظر آتے ہیں۔ آخر کوئی چیز تو مشترک تھی جس نے نیاز کی کمزوری، مومن کو بنایا ـــ ان "اخلاق باختہ" باتوں کے باوجود، مومن کے معاصرین نے مومن کا ذکر ہمیشہ ہی عزّت کے ساتھ کیا۔ سر سیّد نے بھی آثارالصنادید میں مومن کی بڑی تعریف کی ہے ـــ آج نیاز نمبر سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ نیاز کے معاصرین نیاز کے بارے میں کیسی رائے رکھتے ہیں۔

میں نے ان کی تحریروں میں شراب کی باتیں پڑھی ہیں مگر انھیں کبھی پیتے ہوئے نہ پایا۔ ادھر اُدھر پوچھا بھی، مگر ان کی بادہ خواری کا حال نہ کھلا۔ پیتے ضرور ہوں گے

اس لیے کہ دوستوں کو بھی کہتے ہیں کہ "چار انگل شراب پیو اور خدا کو یاد کرو۔" اگر یہ بات نہ ہوتی تو ان کا قلم اتنا سچا اور بے ریا نہ ہوتا۔ شراب میں ہزار عیب ہوں گے، مگر بادہ خوار کا باطن میلا ہونے نہیں دیتی۔ اس باب میں ان کا مسلک کچھ اس قسم کا نظر آتا ہے —— گہ گہ خورد کم خورد تنہا خورد۔

نیاز صاحب کی یوں تو کئی تصانیف ہیں جو سب کے سامنے ہیں مگر میں ایک "غیر مطبوعہ تصنیف" کا بھی ذکر کروں گا۔ شاہ دلگیر، جو نقّاد کے ایڈیٹر تھے۔ ان کے لیے اُنھوں نے ایک قمر زمانی تراشی، صرف ان کے عاشقانہ ٹھمک سے لطف اندوز ہونے کے لیے قمر زمانی کون تھیں کیا تھیں۔ اسے جانے دیجیے۔

یہ وہی قمر زمانی ہیں جن کی وجہ سے دوبارہ نقاد جاری ہوا تھا اور اس میں قمر زمانی کے اپنے خط میں، ان کے مضامین چھپا کرتے تھے۔ شاہ دلگیر کی پہلے تو قمر زمانی سے ملاقات، صرف خط و کتابت کی حد تک تھی۔ مگر یہ کب تک دُور دُور رہتے۔ اُنھوں نے دیدار کے لیے التجاؤں پہ التجائیں کیں۔ بالآخر ملاقات کے لیے دہلی کا کوئی ہوٹل منقرر ہوا —— قمر زمانی آئیں۔ بصد طمطراق آئیں۔ برقع میں تھیں مگر ان کے چلنے کا انداز بڑا ہی کافرانہ تھا۔ آواز میں بھی لوچ تھا۔ پان بنانے میں بھی ایک شانِ دلربائی تھی۔ سُنا ہے کہ جب اُنھوں نے دو اُنگلیوں میں چمچی کو پکڑا تو دیکھنے والے دل پکڑ کے رہ گئے کتھا لگانے کے لیے جب ہاتھ پان پر پڑتا تو چھنگلیا تھرتھراتی اور ایک پُر کیف ارتعاش پیدا ہوتا۔

اس افسانے کی ہر ہر چُول نیاز صاحب نے بٹھائی تھی اور سارے ہی سبق انھوں نے ہی اپنی غیر مطبوعہ تصنیف کو پڑھائے تھے کہ چلنا یوں ہو گا۔ بیٹھنا یوں ہو گا۔ باتیں یُوں کرنا ہوں گی۔ ہاں یوں لگانا ہو گا ــــ دیکھ لیجیے کتنے مکمّل انسان ہیں نیاز صاحب کوئی کام بھی ایسا ہے جس میں انھیں یدِ طولیٰ حاصل نہ ہو ــــ مطلب یہ کہ نیاز صاحب نرے احمق کو برداشت نہیں کرتے ذرا لرچ ہو تو خوب کھیلتے ہیں۔

میرا بڑا جی چاہتا ہے کہ میں بھی معقول آدمی بن جاؤں مگر نہیں بن سکا۔ اچھے بُرے مشاغل کا اتنا ہجوم ہے کہ پناہ بخدا۔ میرے پاس جتنے خط آتے ہیں ان سب کا جواب دینا میرے بس کی بات ہی نہیں رہی۔ پھر یہ بھی نہیں کہ مجھے اپنی اس زیادتی کا احساس نہ ہو۔ مگر میں کیا کروں۔ ہجومِ کار کی زیادتیوں نے مجھے عاجز سا بنا دیا ہے اس کے برعکس نیاز صاحب خطوط کے جواب میں اتنے باقاعدہ ہیں جیسے سُورج کا ہر روز نکلنا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اٹھارہ برس کے عرصہ میں اُنھوں نے میرے کسی خط کا جواب نہ دیا ہو ــ میں کتنا نالائق یہ کتنے باضابطہ، رشک چھوڑ، حسد والی بات ہے یہ!

یہ صرف خطوں کے جواب ہی میں باقاعدہ نہیں بلکہ ان کی پُوری زندگی ہی ایک ضابطے میں ڈھلی ہُوئی ہے۔ انھیں جو کام اِس وقت کرنا ہے وہی کام دوسرے دن اور اُسی وقت کرنا ہے۔ نیاز صاحب خط کا جواب ضرور دیں گے۔ خواہ صرف اتنا ہی لکھا ہو ــــ "تم لکھتو آ رہی ہو۔ بالکل جھوٹ! ــــ نیاز" ــــ میرا خیال ہے کہ نیاز صاحب بھی میری طرح دن رات کے اتنا چھوٹے ہونے پر خوش نہ ہوں گے۔ ضرور چوبیس گھنٹوں

کی بجائے ایک سو چوبیس گھنٹے چاہتے ہوں گے۔ ۶۲ گھنٹے دن کے ۶۲ گھنٹے رات کے، مگر انہیں بھی سب کی طرح ۱۲ گھنٹے دن کے میسر ہیں اور ۱۲ گھنٹے رات کے، مگر ان بارہ گھنٹوں میں یہ کیا کچھ کرتے ہیں۔ آیئے ذرا اس کا تو سراغ لگائیں

صبح اٹھتے ہیں۔ سیر کرتے ہیں۔ خطوں کے جواب دیتے ہیں (اس میں سبھی قسم کے خط ہوتے ہیں۔ عام کاروباری بھی، احباب کے نام بھی، ادبی نوعیت کے بھی اور عاشقانہ بھی) آئے ہوئے اچھے بُرے مضامین پڑھتے ہیں (یہ کام بظاہر تو بڑا شاندار معلوم ہوتا ہے مگر جو کرتا ہے اُسے ہی معلوم ہے کہ ایڈیٹری کس عذاب کا نام ہے) مضامین کی تصحیح کرتے ہیں۔ ناقابلِ اشاعت مضامین واپس کرتے ہیں۔ کھانا کھاتے ہیں۔ قیلولہ کرتے ہیں۔ تصنیف و تالیف کا کام کرتے ہیں دوست احباب سے گپ لڑاتے ہیں۔ چائے نہیں پیتے۔ پان کھاتے ہیں سگریٹ نہیں پیتے۔ شام کو کوئی نہ کوئی دلچسپ کام کرتے ہیں۔ سینما دیکھتے ہیں۔ دعوتیں اڑاتے ہیں، "کسی نہ کسی" سے ملنے چلے جاتے ہیں۔ مطالعہ کرتے ہیں اور پھر سونے سے پہلے بیوی کو یقین دلاتے ہیں کہ میں صرف تیرا ہوں۔

۴

مجھے نیاز صاحب کے خط بڑے پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ مکتوباتِ نیاز میں جتنے خط ہیں ان میں کچھ تو فرضی ہیں جو انھوں نے کسی نہ کسی مسئلے کو خط ہی کے پیرایہ

ہیں لکھنے کو بہتر جان کر لکھ ڈالے مگر بیشتر خط ایسے ہیں جن کا واقعی کوئی مخاطب تھا بھی اور بنتی بھی۔

مکاتیب نمبر کی ترتیب کے وقت، مجھے ان کے کچھ ایسے خط بھی ملے تھے جن میں نیاز صاحب نے اپنے جوان قلم سے خون کی سیاہی چھڑکی تھی مگر میں نے ان کی اشاعت مناسب نہ سمجھی۔ اس لیے کہ مجھے نیاز صاحب کی شخصیت سے ایک نیازمندانہ ربط ہے مگر نیاز صاحب خود اس کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ وہ علی الاعلان راجہ اندر بننے میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں کرتے ——— اس لیے میں بھی انھیں مسیح کیوں سمجھوں۔

یہاں نیاز صاحب کا ایک خط ملاحظہ فرمالیں۔ دنیا خوب صورت معلوم ہونے لگے گی:

اتنا قاتل خط اور اس قدر طویل! ——— تم تو صرف یہی کہنا چاہتی تھیں نا کہ آئندہ میں تمھیں خط نہ لکھوں۔ پھر یہ پورے چھ صفحے کیوں؟ ——— شاید اس لیے کہ صاف صاف ایسا کہتے ہوئے تمھیں حجاب آتا تھا۔

نہیں یہ بات نہیں! ——— میں سمجھتا ہوں تم نے مجھے آہستہ آہستہ ذبح کرنا چاہا۔ اس طرح کہ حلق پر چھری بھی چل رہی ہے، تم مسکرا مسکرا کر مجھ کو تسلیاں بھی دیتی جاتی ہو اور میں بے خبر ہوں۔ یہاں تک کہ دفعتاً

تمھارا ہاتھ شہ رگ تک پہنچ جاتا ہے یعنی تمھارا خط ختم ہو جاتا ہے۔ اس حکم کے ساتھ کہ آئندہ تمھیں کوئی خط نہ بھیجوں — اور — مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی نہایت بیش قیمت چینی کی قاب دفعتاً ہاتھ سے چھوٹ جائے اور فرش پر گر کر چور چور ہو جائے لیکن خیر اس سے ایک فائدہ ضرور ہوا۔ اور وہ یہ کہ تم نے خط لکھنے سے باز رکھ کر مجھے اس کا موقع تو دے دیا کہ جو کچھ کہنا ہے آزادی سے کہہ دوں اور دل کی وہ بات جو تم پر ظاہر نہ کر سکتا تھا کہہ ڈالوں۔ کیونکہ اب مجھے کیا ڈر ہے۔ تم سن نہ سکو گی اور دنیا سننی ہے تو سنے۔ اچھا تو شروع کرتا ہوں۔

ایک تھا بادشاہ۔ ہمارا تمھارا خدا بادشاہ۔

تمھاری سب سے پہلی تحریر جب مجھ تک پہنچی تو میں دیر تک سوچتا رہا کہ اگر یہی باتیں میں تمھاری زبان سے سنتا تو کیا ہوتا — تمھیں خبر نہیں۔ لیکن ہوا یہی!

میں نے تمھاری تحریر کے ایک ایک لفظ کو دیکھ کر، حرفوں کی ہر ہر کشش کو سمجھ کر، کاغذ کے رنگ، اور اس کی عطریت سے مدد لے کر، میں نے تمھاری ایک تصویر کھینچی، کاغذ پر نہیں۔ قلب پر، دماغ کے اس پردہ پر جو صرف نغمہ و نکہت کے نقش کے لیے مخصوص ہے اور میں اس میں

محو ہو گیا ــــ تو کیا میں بتا ہی دوں کہ میں نے تمھاری تحریر کے اندر چھپا ہوا تم کو کیسا پایا ؟ معاف کرنا۔ ممکن ہے کوئی بات خلافِ حقیقت ہو یا تمھارے ذوق کے خلاف، لیکن جب میرا یہ خط تم تک پہنچ ہی نہیں سکتا تو پھر یہ اندیشہ کیوں ؟

اچھا تو سنو اب تم اپنا سراپا ــــ کوئی پسند کرے یا نہ کرے لیکن مجھے تو وہ اس قدر عزیز ہے کہ اگر تم واقعی ویسی نہ نکلتیں تو مجھے افسوس ہوتا۔

کھلتا ہوا سانولا رنگ، یعنی وہ رنگ جو کیفیات سے شروع ہوتا ہے اور کیفیات ہی پر ختم، وہ جسے چھونے کو جی چاہے اور ہونٹوں میں بے اختیار کپکپی سی محسوس ہونے لگے۔ معاف کرنا میرے ہاتھوں نے بھی تمھیں چھوا اور میرے ہونٹوں نے بھی تمھارے لبوں کو مس کیا جو ریشم کی طرح نرم اور پنکھڑی کی طرح نازک تھے ــــ میں نے تم کو نحیف و ناتواں پایا لیکن اپنی رعنائی و کشیدہ قامتی کے لحاظ سے تمھیں ایسا ہونا ہی چاہیے تمھارے بال بہت سیاہ تو نہیں۔ لیکن ان میں ایک خاص قسم کی چمک ضرور ہے اور تھوڑا سا گھونگھر بھی کنپٹی کے بالوں میں مجھے نظر آتا ہے ــــ پیشانی بہت فراخ ہے اور اس میں ایک نیگوں رگ ، اُبھری ہوئی مانگ تک چلی گئی ہے ــــ بھویں کافی چوڑی ہیں اور ایک نہایت ہلکی عنبری لکیر ان دونوں تلواروں

کو ایک دوسرے سے ملا رہی ہے۔ رنگ کے بعد سب سے زیادہ قاتل چیز آنکھیں ہیں۔ ہر وقت کسی خیال میں مستغرق رہنے والی آنکھیں، جن کو ایک بار دیکھ لینا گویا کسی سمندر میں ڈوبتے چلے جانا ہے — چہرہ کتابی — گردن کھنچی ہوئی، تناسب اعضاء کانٹے پر تُلتا ہُوا — اور — چال ایسی جیسے کوئی ناگن راستہ کاٹتی ہوئی سامنے سے گزر جائے۔ عمر تم خود ہی بتا چکی ہو کہ ۲۰ سے کم اور ۱۵ سے زیادہ ہے۔ غالباً ۱۸ سال — یہ تھی تمھاری وہ تصویر جو میں نے تمھارے سب سے پہلے خط کو دیکھ کر اپنے دل پر نقش کی تھی اور اگر میں یہ سب کچھ پہلے ہی لکھ دیتا تو شاید تم اسی وقت مجھے لکھ بھیجتیں کہ آئندہ میرے نام کوئی خط نہ بھیجا جائے۔ میں چاہتا تھا کہ تم مجھ سے زیادہ بے تکلف ہو جاؤ اور میں تم کو ایسے لفظ سے خطاب کر سکوں جو تمھاری خوبصورت پیشانی پر ہلکا سا خم پیدا کر سکے۔ لیکن اچھا ہُوا کہ اس منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی یہ بساط اُلٹ دی گئی اور تم نے زندگی کی اُس تلخ حقیقت کو جان لیا کہ اگر عورت اس کے سمجھنے پر مجبور نہ ہو تو خدائی کا دعویٰ بھی اُس کے لیے کوئی بڑی چیز نہیں۔

ہر چند میں تم کو دُنیا میں آزاد، انسانی دسترس سے دُور، کسی آسمانی دیوی کی طرح بلند دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن میری یہ تمنا پُوری نہ ہُوئی اور تمھاری زندگی کا وہ دور جب تمھارا جسم تمھاری رُوح کے اندر محوِ خواب تھا جلد ختم ہو گیا۔

پھر بتاؤ کہ اب تم کیا کروگی۔ مگر میں یہ کیوں پوچھ رہا ہوں۔ مجھے کیا حق حاصل ہے اور اگر تم کچھ کہنا بھی چاہو گی تو کیسے کہو گی اور اگر کہو گی بھی تو کلیجہ پر کون ہاتھ رکھے گا۔

تمہارے اس چھ صفحہ کی داستان میں سب سے زیادہ تڑپا دینے والی بات یہ تھی کہ تمہارے جسم کے ساتھ تمہاری رُوح کا سودا نہیں ہو سکا۔ باور کرو یہ سُن کر مجھے بہت قلق ہوا اور دیر تک سوچتا رہا کہ تم کس قدر گھبرا رہی ہو گی لیکن میں تو اب تسکین کے الفاظ بھی تم تک نہیں پہنچا سکتا۔ کیا کروں مجبور ہوں۔ اچھا تو لو اب میں اپنی تسکین کی چیزیں اپنے سے جُدا کیے دیتا ہوں اور تمہاری تمام تحریریں جن کو میں نے اس وقت تک حرزِ جاں بنا کر رکھا تھا۔ نذرِ آتش کیے دیتا ہوں۔

اے عزت و شرافت کی دیوی ــــ میری یہ قربانی قبول کر لے۔"

صنفِ لطیف کی نفسیات کا جتنا گہرا مطالعہ ان کے یہاں ملتا ہے وہ انہی کا حصّہ ہے۔ جذبات بھانتا ہیں ان کے ادبی رجحانات کا رُخ سمجھاتی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ کس طرح عورت کی نفسیات کی عکاسی اور نقاشی کرتے ہیں۔

قاضی عبدالغفار نے بھی "لیلیٰ کے خطوط" میں عورت کی نفسیات کی بڑی عمدہ عکاسی کی ہے مگر ان دونوں میں ایک بنیادی فرق ہے۔ قاضی صاحب کے ہاں عورت کی

جو نفسیات ملتی ہے، وہ کوٹھے والیوں کی ہے۔ نیاز کے ہاں شوقین عورتوں کی نفسیات ہے۔

اسی نوع کا، ان کا ایک مضمون "کیوپڈ اور سائیکی" ہے۔ پڑھنے جائیے اور مرحبا کہنے جائیے۔ مگر میں یہاں ان کے مضمون رقاصہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔
اس مضمون میں بڑی بڑی گہری باتیں ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے نیاز صاحب اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ رقاصہ کی تعریفیں کرتے ہیں مگر یہ بھی کہتے ہیں۔ کاش تو صرف میری ہوتی اور اس پر افسوس بھی کرتے ہیں کہ تو سب کی ہے۔ شاید یہی وہ انداز فکر تھا جس کی وجہ سے اُنھوں نے کوٹھوں پر چڑھنے کی بجائے شائستہ عورتوں ہی سے ایک قسم کی ذہنی وابستگی رکھی۔ یہ "وصل کے بعد تنہائی بھی آکے رہے" پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو قطعی طور پر ذہنی آوارگی کی ضد ہے۔ یہ اگر اپنی زندگی کو کچھ محرومیوں سے بھی آشنا نہ رکھتے تو اس رنگ میں اُتنا ہی نہیں سکتے تھے۔ اتنا گہرا مشاہدہ کہ تصوّر کی آنکھیں ہار مان لیں، شاید ہی اُردو میں کہیں ملے۔ اگر یہ اس نوع کے بھی عملی انسان ہوتے اور اپنی جوانی کو نگار کے صفحات سے اٹھا کر ہاتھ پہ لیے پھرتے تو ایسا مضمون قیامت تک نہ لکھ سکتے۔ اُنھوں نے ہمیشہ بازار کی روٹی اور بازار کی چیز سے پرہیز کیا۔ عجیب سے رند پاک باطن ہیں یہ!

آنسہ عائشہ خاں، جنھوں نے نگار کا انشائے لطیف نمبر مرتّب کیا تھا اُنھوں نے اپنے مضمون میں بڑی مردانہ جرأتوں کے ساتھ، کئی باتیں کھلے انداز میں لکھ ڈالیں۔

نیاز اور عائشہ کے مکالمے سُنئے :

نیاز صاحب زیادہ تر سائنٹیفک فلمیں پسند کرتے ہیں۔ میں نے ایک بار پُوچھا " رومانی فلمیں آپ کیوں نہیں دیکھتے تو بولے — رومان کیا جاتا ہے دیکھا نہیں جاتا۔"

ان کو سیر و تفریح سے خاص دلچسپی ہے اور بارہا BIG GAMES میں حصّہ لیا ہے۔ میں نے ایک دن پوچھا کہ آپ کا نشانہ کبھی خطا بھی جاتا ہے بولے " اکثر۔ مگر ہرنیوں کی حد تک کبھی نہیں۔"

ان کا یہ فقرہ جو بے ساختہ ان کی زبان سے نکل گیا تھا میں کبھی نہ بھولوں گی — " ہر حسین عورت میری معشوقہ ہے خواہ وہ دُنیا کے کسی گوشے میں ہو۔ — میں نے پوچھا " اگر حسین نہ ہو"۔ بولے " کوئی عورت غیر حسین نہیں ہوتی۔ عورت ہونا بجائے خود اک حُسن ہے "۔ میں نے کہا۔ کم از کم اخلاقی حیثیت سے ضرور اس کی اچھائی، بُرائی کا فیصلہ کرنا پڑے گا۔ فرمایا کہ " عورت جتنی غیر محتاط ہوگی اتنی ہی زیادہ چاہے جانے کے لائق ہے۔"

یہی عائشہ خاں اپنے مضمون میں کہتی ہیں — " نیاز صاحب عورت کو چھوڑ کر ہر معاملہ میں اعتدال پسند ہیں۔"

یہاں میں ایک بات خود نیاز صاحب سے پوچھ کر آگے چلوں گا۔ " یہ آنسہ عائشہ خاں کون ہیں؟" — آپ کے دوست کی بیٹی ہیں۔ بجا ارشاد۔ مگر یہ تو بتائیے

یہ خا تون تو کچھ آپ ہی کے انداز میں سوچتی اور آپ ہی کے انداز میں لکھتی ہیں ـ ٹھیک !
آپ کی شاگرد جو ہوئیں ـــ مگر ایسے شاگرد کتنے خوش قسمت ہیں اور کتنے ہیں جو
شاگرد رہ کر بالکل اُستاد نظر آتے ہوں ۔

اچھا اچھا قبلہ نیاز صاحب آپ اتنے غصّے سے میری طرف نہ دیکھیں میں
آگے چلتا ہوں، ایک ذرا سی بات کی وضاحت میں مجھے آپ کی ناراضی منظور نہیں

جہاں تک میں نیاز صاحب کی تحریروں سے اندازہ کر سکا۔ وہ تو یہی کچھ ہے
کہ ابتدائی زندگی انھیں بڑی پابندیوں اور بڑی گھُر کیوں کے سے ماحول میں بسر کرنی
پڑی مگر جب عمرِ ایسی لگی جس میں ذہنی نشاط کی قیمت معلوم ہوتی ہے تو پھر انھوں
نے عشق کی حاجت کو عیب کا درجہ دینا پسند نہ کیا ۔

میٹھا برس لگنے کے بعد اُنھوں نے کیا کچھ کیا ہوگا ۔ اس کا کچھ زیادہ پتہ نہیں چلتا
یہ ہزار رنگے سہی، مگر پھر بھی جوش اور فراق کی طرح نہیں ہیں جو بہ آوازِ بلند کہتے ہوں
کہ میں نے دو درجن عشق کیے اور میں نے تین درجن عشق کئے ـــ یہ درجنوں عشق والی
بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی ۔

ویسے نیاز صاحب نے بھی اپنی رومانی زندگی کا تعلق لکھنؤ، رامپور، بھوپال، دہلی
ہانسی اور مسوری سے جوڑ رکھا ہے مگر ہمیں کیا، بے شک امریکہ تک مار کریں ۔
.جمالیاتی ذوق کے اعتبار سے یا انجائیمنٹ کی حد تک کرشن کنہیا ہیں یہ گوپیاں
بہت سی نظر آتی ہیں مگر رادھا کون ہے ۔ اس کا حال نہیں کھُلتا ۔ دوسرے نیاز صاحب

ہر عورت کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ اس کے ساتھ دلچسپی لی جائے؛ وہ "مٹی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں" کے قائل نہیں بلکہ اس شعر کی تفسیر ہیں ؎

ہر غنچہ لب سے عشق کا اظہار ہے غلط
اِس مبحثِ صحیح کی تکرار ہے غلط

یہ جتنے شاہد باز ہیں۔ اُتنے شاہد کار نہیں۔ یہ خوب جانتے ہیں کہ کہاں تیرنا چاہیے اور کہاں نہیں تیرنا چاہیے۔ جہاں جہاں بھی اُنھوں نے ذہنی رفاقت محسوس کی ہوگی۔ وہاں یہ تیرے بھی ہوں گے۔ ڈوبے بھی ہوں گے مگر ہمیں انسانی لطف گیری کا مارجن تو دینا ہی ہوگا۔ سُنا تو آپ نے بھی ہوگا ـــ "پہلا پتھر وہ مارے جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔"

نیاز صاحب کی عمر اس وقت اسّی برس کے لگ بھگ ہے۔ اگر میری عمر بھی اتنی ہوتی تو مجھے یہ سب کچھ لکھنا چاہیے تھا۔ اب تو میں نے ان کی بزرگی کا ذرا بھی لحاظ نہیں کیا۔ مگر میں لحاظ کرتا بھی کیوں؟ ان کی بارگاہ میں، میں نے تو ہمیشہ برابری میں بزرگی گھُلی ملی اور بزرگی میں برابری گھُلی ملی کا سا انداز پایا۔

اقرار کرتا ہوں۔ اگر میں نیاز صاحب کی خدمت میں اتنا گستاخ نہ بنتا تو اچھا ہی تھا۔ مگر میں نے یہ سب کچھ دانستہ کیا ہے۔ اس لیے کہ میرا خیال ہے اور لوگ ضرور نیاز صاحب کو فرشتہ بنا کے چھوڑیں گے۔ مگر میں اتنے بڑے آدمی کو اتنا ذلیل ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

———
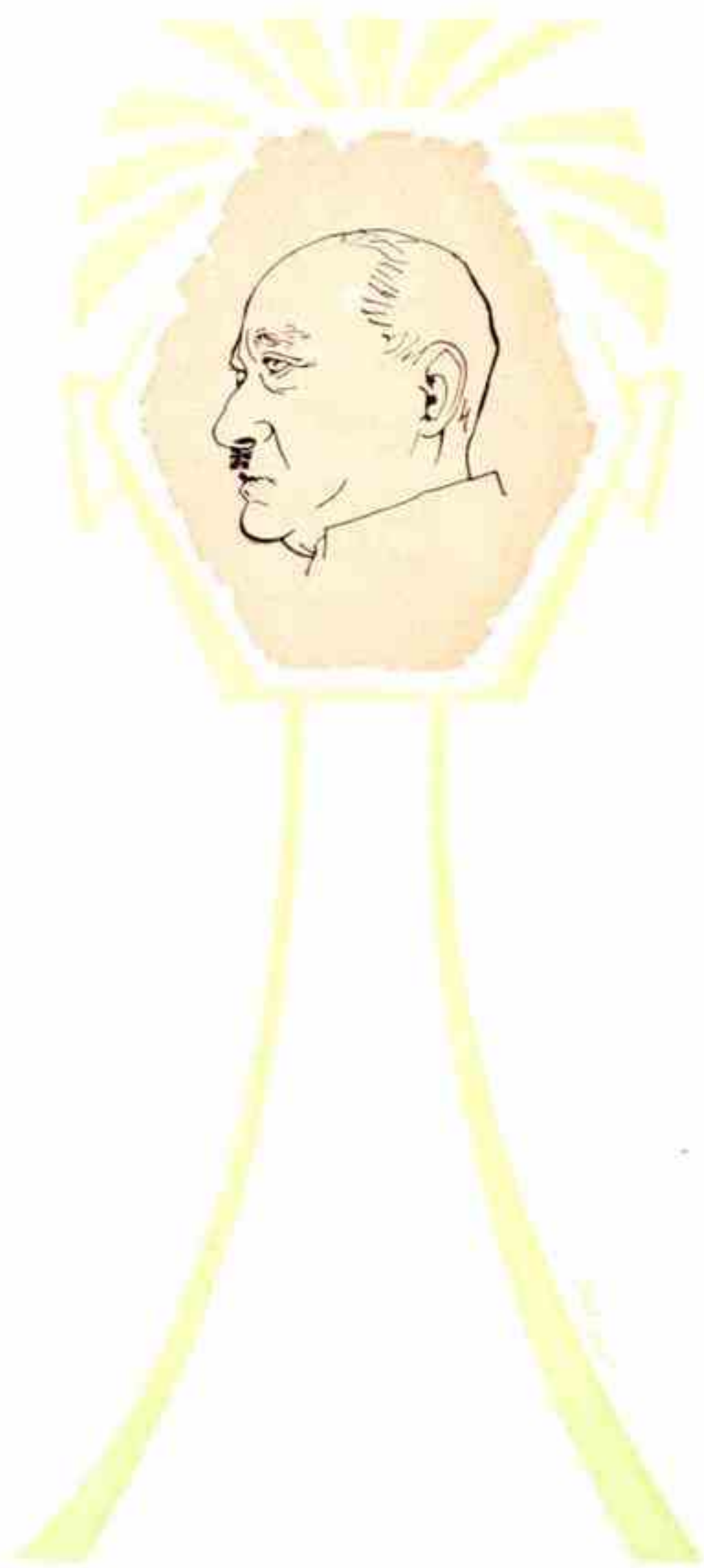
جوش صاحب

ابھی تھوڑے دن ہوئے کہ میں نے نیاز فتحپوری پر اپنے تعصبات کا اظہار کیا تھا۔ آج جوش صاحب پر اپنے تاثرات کا اظہار کر رہا ہوں جو بلاشبہ "تعصبات" ہی کی ذیل میں آئیں گے۔

ان دونوں "بزرگوں" کو پڑھنے میں مجھے ان کی کئی رگیں ایک ہی جگہ جاکر ملتی ہوئی نظر آئیں۔ یہ میرے مطالعہ کا قصور ہے یا ان کرمفرماؤں کا، کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اُردو کے ان جیالوں کو اپنے اپنے رنگ میں دکھانے کے لئے بڑے جتن کرنے پڑیں گے۔

دونوں ہی شاہد باز، دونوں ہی مذہباً کافر، دونوں ہی قلندر اور سب سے بڑا عیب دونوں کا یہ کہ تقاضائے انسانیت سے آشنا، نہ صرف آشنا

بلکہ پیغمبرانہ حد تک بُرچارک۔

یہ صرف انسان ہی نہیں، شاعر بھی ہیں۔ دوہری تہری خوبیاں اور خرابیاں، اس لیے یہ اچھے کام بھی کریں گے اور بُرے کاموں کی اوسط بھی خراب نہ ہونے دیں گے۔ اس اعتبار سے یہ مجھے مکمل انسان نظر آتے ہیں۔ دونوں رُخ مکمل!

نواب محمد علی خاں ان کے چچا تھے۔ آمدنی کوئی لاکھ روپے سالانہ کی ہوگی۔ کچھ اتنی ہی آمدنی ان کے والد بزرگوار (نواب بشیر احمد خاں) کی تھی جو ان صاحب حوصلہ بزرگوں نے بدانتظامی، مقدمہ بازی اور دل کے ارمان نکالنے کی نذر کردی۔ تلچھٹ ہیں جو کچھ انھیں ملا اُنھوں نے بھی خاندانی روایات کو شرمسار نہ ہونے دیا۔ خوب خوب عیش کیے خوب خوب جئے۔

..ملیح آباد کے پٹھان، شبیر حسن خان نام، تخلّص جوشؔ، نواب ابن نواب کے بعد صرف جوشؔ، شبیر حسن خاں بھی نہیں۔

اجداد میں شعروشاعری کے چرچے، بلکہ شاعر بھی، وہی علّت ہوتے ہوتے ان تک پہنچی۔ مگر ان کے بزرگ رسوا کُن حد تک 'بدنام' نہ تھے جتنے کہ یہ ہیں۔ اگر اُن کا ذکر ہوا بھی تو اس لحاظ سے کہ گویا اور بشیر، جوشؔ کے اجداد میں اچھے شاعر تھے۔

کئی معاملات میں یہ دوہری شخصیت کے مالک ہیں۔ کبھی اتنے خود غرض کہ آپ ہکّا بکّا رہ جائیں۔ کبھی اتنے مخیّر کہ عقل نہ مانے، ان کے مزاج کی دھوپ

چھاؤں، انسانی فطرت ہی کی غماز ہے ۔ ایک رُخ کے اظہار سے بونے،
اور دُوسرے رُخ کے اظہار سے، عام انسانوں کے قد سے اُونچے نظر آئیں گے
اس لیے چھوڑیئے اس قصّے کو!

جوش صاحب نے اپنی شخصیّت پر کوئی نقاب نہیں ڈال رکھی۔ یہی وجہ
ہے کہ یہ اپنی ستر پوشی کے باوجود ڈھکے چھُپے نہیں رہتے۔ وہ اور لوگ ہوں گے
جو اپنی زندگی اور اپنے خیالات کو اس ڈر سے قابو میں رکھتے ہوں گے کہ ہمیں
دُنیا کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں مگر جوش صاحب کو یہ ملمّع بازی پسند نہیں، یہ
مصلحت آمیز قسم کی قیود سے قطعی طور پر ناآشنا ہیں۔

میں کئی ایسی شخصیتوں سے واقف ہوں، جنھوں نے اپنے اُوپر شرافت
کے غلاف چڑھا رکھے ہیں۔ ایسے "اللہ والوں" کو جھانکنا مشکل ہے چہ جائیکہ
پڑھ لینا۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن پر سے اگر ایک غلاف اُتار دیا جائے
تو وہ بالکل آدمی کی صورت میں نظر آنے لگ جاتے ہیں۔ بعض کے دو غلاف
اُتارے جائیں تو بعض کے تین اُتریں تو ۔۔۔ اور بعض شخصیّتیں تو بالکل پیاز
ہوتی ہیں۔ چاہے جتنے غلاف اُتار ڈالیں۔ ہاتھ کچھ بھی نہ آئے گا۔

یہ چھوٹے اور بڑوں کو آپ اور جناب کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ دوست
ہو تو، دشمن ہو تو، وہ آپ بھی ہے اور جناب بھی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ
جوش صاحب بڑے مؤدّب ہیں۔ جناب! یہ بڑے پھکّڑ بھی ہیں۔ ان کے

نزدیک جو زیادہ محترم نہیں۔ وہ تو آپ اور جناب کے کھاتے میں، جو دوست ہے یار ہے۔ وہ ہے دوسرے کھاتے میں۔ بیچ والا راستہ ان کے یہاں نہیں ابے تبے، تُوں تراں ان کے ہاں نہیں چلتا۔

جس ماحول میں یہ پروان چڑھے۔ وہ ان کے الفاظ میں یُوں تھا:

ایک بڑے کڑیل پٹھان، بڑے ہی رعب داب والے، ہمارے والد صاحب کے پاس آیا کرتے تھے۔ جب وہ آتے تو ہمارے والد آنکھیں نیچی کر لیتے تھے۔ ہم بڑے پریشان ہوتے تھے کہ ہمارے میاں ایسا کیوں کرتے ہیں۔ ایک دن پوچھ ہی بیٹھے "میاں کیا آپ ان سے ڈرتے ہیں؟"

"ہاں بیٹا! ہم ان سے ڈرتے ہیں۔"

"آخر کیوں؟"

"بات یہ ہے کہ یہ صاحب فلاں جگہ کے رہنے والے ہیں۔ کبھی ان کا بڑا دبدبہ تھا۔ بڑے بہادر اور مال دار تھے مگر اب کچھ عرصے سے ان کے حالات خراب ہو گئے ہیں۔ زندگی کے دن کاٹنے کے لیے اب یہ مجھ سے گزارہ لینے آتے ہیں۔ انھیں دیکھتے ہی اپنی آنکھیں نیچی کر لیتا ہوں تا کہ نہ آنکھیں چار ہوں اور نہ اُنھیں شرمساری ہو۔"

بچپن کی ایک بات اور بھی سناتے ہیں:

عہدِ طفلی میں ہم پہ بڑی کڑی نگرانی ہوتی تھی۔ مثلاً یہ کہ اُونچا نہ بولیں۔ ننگے سر

نہ بھریں۔ کوئی چیز بازار میں نہ کھائیں۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے نہ چلیں۔ ایک دن شامتِ اعمال، ہم دونوں بھائی اپنے ایک ہمجولی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے گھوم رہے تھے۔ کسی طرح اس کا علم والد صاحب کو ہو گیا۔ اُنھوں نے ہمیں سوتے سے جگایا۔ دریافت کیا۔ کیا تم دونوں آج فلاں لڑکے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے چل رہے تھے۔ ہم نے اقرار کر لیا۔ کیا کرتے۔

جس وقت والد صاحب یہ پُوچھ رہے تھے۔ اس وقت وہ حقّہ پی رہے تھے۔ اُنھوں نے حقّہ پر سے چلم اُتار ی۔ دہکتے ہوئے کوئلے ہم دونوں کے ہاتھ پر رکھ دیئے —— خبردار جو آئندہ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے چلے۔

اس کے بعد جوش صاحب نے یُوں تبصرہ کیا۔ والد صاحب نے بھی ہمیں بچپن میں سنوارنے کی کیا کیا ترکیبیں نہ کیں مگر جو ہوں ہی ازلی بدمعاش بھلا وہ کیسے سدھرتے۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے "انگارہ بازی" ان کے والد کے مزاج میں شامل تھی۔ ایک واقعہ اور بھی میں نے انھی کی زبان سے سُنا تھا۔ ذرا تمہید کے بعد وہ بھی سناتا ہوں:

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ علاّمہ جوش ملیح آبادی کو زبان کی غلطیاں پکڑنے کا بڑا شوق ہے (میرے پاس بیٹھے ہوتے تو ابھی کہتے۔ ارے نالائق غلطی کی جمع اغلاط ہے۔ غلطیاں نہیں) پڑھے لکھوں کو بھی نکو بنا کے

رکھوا دیں گے۔ یہ جو ایک رسالے کا جوش نمبر نکل رہا ہے۔ وہ ان کے اسی شوق کے صدقے میں تو نکل رہا ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے مدیر رسالہ مذکور کے جد امجد کی کتابوں میں سے اتنی غلطیاں نکالیں کہ انھیں بھی جوش صاحب کی غلطیاں نکالنے کے لیے پورا ایک نمبر چھاپنا پڑ رہا ہے۔

یہ خوبی جوش صاحب کی اکتسابی نہیں بلکہ انھیں ورثتاً ملی ہے۔ کہتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ کہا "پان لگاؤں ؟" ــــ تو ابا جان نے اسی وقت انگارہ نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دیا ــ اور کہا کہ غلط زبان بولنے پر اسی طرح سزا ملے گی۔ پان بنایا جاتا ہے لگایا نہیں جاتا۔

جوش صاحب سے خط و کتابت تھی: تکلف کی سی فضا میں: اجنبی سے تعلقات تھے۔ جب میں لاہور سے دلی پہنچا۔

"جی ہاں!"

"زندہ ہوں"

"بہت اچھا، بہت اچھا ــ اچھ ــ"

"اخاہ! واہ وا، بھئی خوب آئے۔ بیٹھو بیٹھو!"

"میرے ایک دوست پاکستان سے آئے ہیں۔ ان سے کہہ رہا تھا"

"کہہ دوں گا"

"تم تو اچھی ہو۔"

"کہہ تو دیا ہو جائے گا۔"

"جی ہاں! میں نے کہہ دیا تھا کہ جب وہ کپڑے پہن لیتی ہیں تو بڑی خوبصورت معلوم ہوتی ہیں۔"

"آہا ہا ہا!"

"آداب عرض ہے!"

جوش صاحب سے ملنے جب میں ان کے دفتر پہنچا تو وہ ٹیلیفون پر کسی سے باتیں کر رہے تھے۔ جو اور جس قسم کی باتیں ہوئیں۔ وہ آپ نے بھی سن لیں۔

چائے کا آرڈر دیا۔ چائے آئی۔ میں نے بنائی۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا۔ "بہت پی ہے۔ خدا کے لیے مجھے نہ پلایئے۔"

"چلئے پی لو میاں! خدا وُدا کوئی نہیں ہے۔ خدا کا لفظ تو بزدلی کے بطن سے پیدا ہوا ہے۔ پرانے وقتوں کے لوگ جنگلوں میں رہتے تھے۔ رات کو سانپ سونگھ جاتے تھے۔ دن کو شیر کھا جاتے تھے۔ بجلی چمکتی تھی تو لرز جاتے تھے۔ لوگوں نے ان مصیبتوں سے چھٹکارا پانے کے لیے دل کو سہارا یوں دیا کہ کوئی طاقت بالا ہے جو ہمیں ان مصیبتوں سے نجات دلا سکتی ہے۔ امید، بزدلی، اور ناطاقتی کا نام خدا ہے ــــ جب آباؤ اجداد خواب میں آنے لگے تو سوچا کہ مرنے کے بعد بھی روح باقی رہتی ہے۔ اس سے سمجھ دار لوگوں نے

بیوقوفوں کی بے بسی سے فائدہ اٹھا کر خدا کو حقیقت منوالیا۔"

اس بھرپور وار کے بعد ان صاحب کو چائے پینی پڑی۔ بلکہ انھوں نے پہلے ہی دو ایک فقروں میں جھنٹ ہو کر چائے پینی شروع کر دی تھی۔ یہ تقریر کر رہے تھے۔ وہ چائے پی رہے تھے۔ جب یہ چائے پینے لگے تو انھوں نے ایک سوال اور جھاڑ دیا۔

"جوش صاحب آپ کچھ بھی کہیں۔ مگر آپ لوگوں کے دلوں سے خُدا اور مذہب کے تصوّر کو ختم نہیں کر سکتے۔"

"جناب ایک بات تو یہ ذہن میں رکھیں کہ رسُولؐ نے خدا کو پیدا کیا۔ ورنہ اللہ تھا کہاں، کوئی بھی رسُولؐ سے پہلے ان "صاحب" سے واقف نہ تھا۔ رسولؐ نے مذہب کی آڑ میں لوگوں کو لالچ بھی دیا، ڈرایا بھی، دھمکایا بھی ــــ لالچ یہ دیا کہ اگر تم اللہ کے بنائے ہوئے دین پر چلو گے تو مرنے کے بعد جنّت میں جاؤ گے۔ جنت میں شراب ملے گی۔ حُوریں ملیں گی۔ دودھ اور شہد کی نہریں ہوں گی چونکہ اہلِ عرب شراب کے رسیا تھے، اور عورتیں ان کی کمزوری تھیں۔ اس لیے وہ رسُولؐ کے کینے سینے میں آگئے (نقلِ کفر، کفر نباشد) اس لیے کہ رسُولؐ نے موت ایسی خوفناک حقیقت کو بھی لذیذ ترین شے بنا دیا تھا۔ محمدؐ واقعی دنیا کا سب سے بڑا انسان گزرا ہے جس نے عرب ایسی جاہل قوم کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیا۔ اسی لیے میں نے کہا ہے ؎

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوت حق کے لئے
اگر رسولؐ نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

ورنہ مذہب تو فطرت انسانی کے ساتھ ایک گستاخی ہے۔"

میں نے بھی ذرا چڑایا۔

"یہ تو ٹھیک ہے کہ آپ کے ہاں مذہب کی بنیادیں لرز رہی ہیں مگر ہمارے ہاں ایسا نہیں ہے۔ہمارے ہاں تو مذہب ہی سب کچھ ہے (یہ باتیں اُن دنوں کی ہیں جب جوش صاحب بھارت کے شہری تھے)

"جی ہاں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کے ہاں بھی کیا ہے۔آپ کے ہاں کا جو سب سے بڑا مولوی ہے۔ وہ اور میں بھوپال میں ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔ اس وقت تو وہ بالکل آدمی تھے۔اب مولوی بن گئے ہیں۔ لیڈر بن گئے ہیں۔ پیٹ بُری بلا ہے۔اگر ان کے معاشی حالات اچھے ہوتے تو وہ ہرگز مولوی نہ بنتے بدستور آدمی بنے رہتے۔ مجھے ان سے اور کوئی شکایت نہیں۔ بجز اس کے کہ وہ پڑھے لکھے ہو کر مولوی بن گئے۔خوب پہچانا ہے اُنھوں نے بھی مسلمان قوم کو۔ مذہب کے نام پر کوئی جتنا چاہے اسے بیوقوف بنالے۔"

باتوں کا رُخ بڑا غلط ہو گیا تھا۔اس لئے حاضرین میں سے کسی نے کہا۔

"جوش صاحب! ان باتوں کو چھوڑیئے۔کوئی رباعی چھیڑیئے۔"

"بہت اچھا ڈارلنگ۔" کہہ کر سامنے رکھی ہوئی ڈبیا سے پان لے کر

شعر و شاعری کا آغاز فرما دیا۔ بہت سی رباعیاں پڑھیں۔ ان میں سے دو چار آپ بھی سُن لیں :

تخمین کو جس وقت بصیرت نکلی
پردہ میں ذہانت کے غباوت نکلی
جب علم کی سطح کو ذرا سا کھُرچا
اک جو کی مسافت پہ جہالت نکلی

اللہ میں حکمت جو نہیں پاؤں گا
میں حشر میں بندگی سے شرماؤں گا
ہو گی جو بجائے عدل رحمت مجھ پر
تو اپنا گلا کاٹ کے مر جاؤں گا

چُونکہ اس وقت ان کا موڈ مذہب اور علم کے دھارے کی طرف بہہ رہا تھا اس لیے اُنھوں نے رُباعیاں بھی ویسی ہی پڑھیں۔ یہ بحث بعد میں کریں گے کہ مذہب کے معاملے میں ان کے اصلی خیالات کیا ہیں اور ان کی باتوں میں زیبِ داستاں کے لیئے کتنا کچھ ہوتا ہے اور کیوں !

یہاں ذرا ذہن کا ذائقہ بدلنا چاہیئے اور جوش صاحب کے خاص رنگ کی بھی ایک دو رُباعیاں سُن لینی چاہئیں جو اُنھوں نے اسی وقت آنکھیں بند کر کر کے اور لہرا لہرا کے پڑھی تھیں :

زلفیں باندھیں مگر بکھرتی ہی رہیں
گھڑیاں روکیں مگر گزرتی ہی رہیں
امید کا رخسار میں بھرتی رہیں رنگ
اور یاس کی جھُرّیاں اُبھرتی ہی رہیں

کاکل کھل کر بکھر رہی ہے گویا نرمی سے ندی گزر رہی ہے گویا
آنکھیں نری جھکے ہی ہیں مجھ سے مل کر دیوار سے دھوپ اُتر رہی ہے گویا

یہ تھی میری پہلی تفصیلی ملاقات! سن ہوگا ۱۹۵۴ء!

میں ان کے پاس وہاں کوئی دو گھنٹے بیٹھا ہوں گا۔ ان کی باتیں ایسی سحر کن تھیں کہ مجھے ان کے تکلم کی سحر آفرینیوں میں گم ہوجانا پڑا۔ یہ ہر بات کو اُس انداز میں نہیں سوچتے جس طرح سوچا جاتا ہے بلکہ ان کے سوچنے کا انداز بھی اپنا ہے جو عجیب و غریب ہونے کے باوجود غور و فکر پر آمادہ کر لیتا ہے

شام کو پھر جوش صاحب نے اکٹھے مل بیٹھنے کا پروگرام بنایا تھا۔ کھانے کی دعوت دی اور یہ بھی نوید سنائی کہ شعر و شاعری بھی ہوگی۔

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں! میں پہنچا۔ مختصر سی نشست تھی۔ چھپٹی بوتل سامنے رکھی تھی۔ اُس شغلہ دارو سے سبھی کو شوق فرمانے کی دعوت دی گئی۔ اپنے اپنے ظرف کے مطابق سبھی نے ہاتھ بڑھائے جو میری طرح کے ازلی بزدل تھے وہ تشنہ لب رہے۔

یہ پیتے جاتے تھے اور شراب پر وعظ فرماتے جاتے تھے اور ہم بزدلوں کو سمجھا یہ رہے تھے کہ اسلام کی رُو سے بھی شراب پینا ناجائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ قرآن میں آیا ہے کہ جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز مت پڑھو۔ مگر نشے کی حالت میں شعر کہنے، پڑھنے اور سننے سے نہیں روکا گیا۔ میرے نزدیک تو یہ بھی

ایک عبادت ہے۔ نماز روزہ تو انسان اپنے لئے پڑھتا اور رکھتا ہے مگر شاعر اپنا خونِ جگر، اللہ کے بندوں کے لئے صرف کرتا ہے۔

یہ ماحول تھا، جس میں جوش صاحب نے اپنی نظم " جھومتی برسات " شروع کی اور ایسے جذب کے ساتھ پڑھی کہ لطف آ گیا۔ اس میں ایک لطیفے کی بات یہ بھی ہے کہ انھوں نے یہ نظم ترنم کے ساتھ پڑھی۔ ترنم تو خیر پٹھانی قسم کا تھا لیکن اس ترنم میں ذرا سی ایک بات ضرور تھی۔ میں اس نظم کے کئی مصرعوں پہ کھو سا گیا ہیں شعر بڑے بے ڈھنگے طریقے سے سنتا ہوں۔ وہ یوں کہ شاعر ہلکان ہو رہا ہے اور میں چپ بیٹھا ہوں کبھی کسی شعر پہ واہ کہہ دیا تو کہہ دیا۔ ورنہ چپ، وہ بھی اتنی مدھم آواز میں کہ شاعر سن نہ سکے۔ لیکن اس دن نظم سنتے ہوئے میں نے اپنی روایات کو توڑ دیا تھا۔ میں بے خود ہو گیا۔ سرشار ہو گیا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں نے جی کھول کر داد دی۔ میرے جاننے والے حیران تھے کہ میں موج میں ہوں حالانکہ میں موج میں نہ تھا بلکہ اس دن مجھے اندازہ ہوا کہ کوئی کتنا ہی بد ذوق کیوں نہ ہو وہ اچھے شعروں پہ وجد میں بھی آ سکتا ہے۔

اس ضمن میں مجھے ایک بات یاد آئی۔ نواب جعفر علی خاں اثر لاہور آئے ہوئے تھے۔ وہ میرے ہاں تشریف لائے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ مجھے دوسرے شعرا کے اچھے شعر سنائیں۔

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ ان دنوں فراق گورکھپوری اور اثر لکھنوی میں

ٹھنی ہوئی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف لکھنا نقوش ہی سے شروع کیا تھا ـــ اور اثر صاحب مجھے فراق پارٹی کا آدمی سمجھتے تھے۔

اثر صاحب نے بڑے بڑے پیارے شعر سنائے۔ میں بے حد لطف اندوز ہوا مگر انھوں نے ایک شعر ایسا سنایا کہ میں تڑپ اُٹھا۔ بے اختیار ہو گیا۔

اثر صاحب نے میرا رنگ دیکھا تو فرمایا۔" اب تو بے قابو ہونا ہی تھا۔"

میں نے سنبھل کر کہا۔" جی!"

" میں نے بڑے بڑے اساتذہ کے شعر سنائے مگر اچھلے تو فراق کے شعر پر۔"

میں نے عرض کیا۔" آپ مجھ سے جس کی چاہے قسم لے لیں مجھے اس سے پہلے علم نہ تھا کہ یہ شعر فراق کا ہے۔"

معلوم ہوا کہ اچھا شعر ہو تو وہ پتھر ایسے آدمی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

ہاں تو بات جوش کی نظم "جھومتی برسات" کی ہو رہی تھی ـــ اس کے بعد میں نے دوبارہ یہی نظم ایک ایسی رنگین محفل میں سُنی کہ جس کا ماحول ہی شاعرانہ تھا متعدد مجسّم شعر اور متعدد مجسّم مصرعے بہ نفسِ نفیس موجود تھے اور راجہ اندر یعنی کہ جوش صاحب لہرا لہرا کے پڑھ رہے تھے:

ہاں، دیکھ، ذرا مرے سرو لبِ جُو
گھنگھور گھٹاؤں کا یہ چلتا ہوا جادو

زرتار دُپٹوں کے یہ اُڑتے ہوئے پلّو
یہ کُنج میں رندانِ سیہ مست کی یاہُو

اے دولتِ پہلو
ہاں، تان اڑا تان، قمر پارہ و گُل رو

اے دولتِ پہلو
ساحل پہ یہ اُڑتے ہوئے جنّت کے نظارے
افلاک پہ یہ سُرخ دوشالوں کے کنارے
بجلی کی لپک ہیں یہ حسینوں کے اشارے
اُمڈے ہوئے دریا کے اُبلتے ہوئے دھارے
دھاروں میں گھری ناؤ کے مُڑتے ہوئے چپّو

اے دولتِ پہلو
ہاں سوچ، دِوانے ہوں نہ کس طور سے لمحات
جب ناز سے اُبھرے ہوئے کولے پہ دھرے ہات
دن کو ہو فروشندہ و رقصندہ جواں رات
کیا بات ہے، برسات ہے، برسات ہے، برسات
لہراؤں سماوات پہ چل جائے جونتا بو

اے دولتِ پہلو
ہاں، تان اُڑا تان، قمر پارہ و گُل رو

اے دولتِ پہلو

اُس ماحول نے اس نظم کو بڑا دُور پہنچا دیا تھا۔ ہر مصرعہ پہ جوش صاحب کے اشارے اور قدرے ایکٹنگ غضب ڈھا رہی تھی۔ تصوّر فرمائیے جب زرتار دُپٹّوں کے ذکر پر، زرنار دُپٹّوں کی طرف اشارے ہوں۔ کُنج میں رندِ سیہ مست کی یا ہُو کے وقت یا ہُو کے نعرے لگیں۔ بجلی کی لپک میں حسینوں کے اشاروں پر، اشارے ہوں — اور پھر ناز سے اُبھرے ہُوئے کُولے پہ دھرے ہات — یہ ان کا کولھوں پہ ہاتھ دھر کر ایکٹنگ کرنا، بھُولنے والا سماں نہیں اور یہ سب کُچھ مخصوص دوستوں کی محفل ہی میں یا ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس ماحول میں ہر پتہ ڈول رہا تھا۔

میں نے جان بُوجھ کر، آپ کو جوش صاحب کی ملحدانہ سوچوں سے دُور لے جانے کی کوشش کی اور اس کے ساتھ میں نے کوشش اس امر کی بھی کی کہ ذکر "پری وش" کا چھڑ جائے تاکہ آپ کا دل بہلا رہے۔ اس لئے کہ انسان یا تو خدا کے نزدیک ہونے میں خوش رہ سکتا ہے یا پھر — یا پھر — !

اللہ کا شکر ہے کہ بعد میں بھی جوش صاحب سے ملنا جلنا رہا۔ ورنہ میری بھی ان کے بارے میں وہی رائے ہوتی جو اس وقت آپ کی ہے یعنی "بدتمیزی کی حد تک مذہب دشمن ہیں۔"

مذہب کے معاملے میں ناپختہ عمر تک سبھی ٹھیک ٹھاک ہوتے ہیں۔ یہ

بھی ٹھیک ٹھاک تھے۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند، چہرے پہ نورانی ڈاڑھی، غرض مجھ جیسے اور آپ جیسے مسلمان تھے۔ جو زبان سے اپنے آپ کو مسلمان کہتے رہتے ہوں اور خدا اور رسولؐ کا نام آتے ہی گردن جھک جاتی ہو۔ مگر ہمارا عمل؟ سراسر غیر اسلامی نماز روزہ بھی دکھاوا، اس لیے کہ جب تک مذہب کی روح کو سمجھا نہ جائے اور اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھال نہ لیا جائے۔ اُس وقت تک تمام نعرے سیاسی اور کاروباری ہوں گے۔ آج کسی بھی بڑے سے بڑے عالم کو دھیان میں رکھ لیجئے اور اس کا مقابلہ رسول اللہؐ کے کسی ادنیٰ سے صحابی سے بھی کر کے دیکھ لیجئے۔ عقل و ہوش کی ساری سیڑھیاں کھسکتی نظر آئیں گی۔

جوشؔ صاحب جن خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ میں ان کا ہمنوا نہیں قطعاً نہیں اور میں اُن مولویوں کا بھی ہمنوا نہیں جو خدا اور رسولؐ کا ذکر بھی معاوضہ لے کر کرتے ہوں بلکہ میرے دل میں اُن درویشوں اور اُن بوریہ نشینوں کا احترام ہے جنھوں نے مذہب کی خدمت اس انداز سے کی جس میں نمائش کا کوئی پہلو نہ تھا بلکہ عاجزی ہی عاجزی تھی۔

جوشؔ صاحب آج بہ ظاہر دہریئے نظر آتے ہیں مگر یہ کٹر شیعہ بھی تو سا تھ ہی ہیں۔ کیا کوئی شیعہ دہریہ ہو سکتا ہے؟ آپ کہیں گے ہو کیوں نہیں سکتا۔ جوشؔ صاحب ہی کو دیکھ لیجئے مگر یہ جواب تسلی بخش نہیں۔ اس لیے کہ دہریہ کبھی بھی شیعہ نہیں ہو سکتا۔

یہ حضرت علی کرم اللہ وجہٗ اور امام حسین کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے۔ رسولؐ
کی عظمت کو بھی دل و جان سے مانتے ہیں۔ بس ذرا خدا سے دل لگی رکھتے ہیں
میرے نزدیک یہ ہم جیسے ¾ مسلمان ہیں اور ¼ جو مسلمان نہیں ہیں تو اس
قلابازی کی بھی ایک وجہ ہے۔ جب یہ حیدرآباد دکن میں ملازم تھے تو انھیں
ایک دن یکلخت یہ آرڈر ملا کہ پندرہ دن کے اندر اندر یہاں سے نکل جائیے۔
اس وقت ان کا ساتھ کوئی دس بارہ آدمیوں کا تھا۔ دو بچے تھے۔ بیوی تھی
اور اس کے ساتھ عزیز و اقارب۔ حیدرآباد سے نکلے تو تین برس تک ذہنی
اذیتوں میں مبتلا رہے۔ پیٹ کی مار کے ہاتھوں عاجز رہے۔ تن کا رشتہ
روح سے برقرار رکھنا محال ہو گیا۔ اُس وقت جو ڈگمگائے تو آج تک نہیں
سنبھلے۔ کہتے تھے کہ خدا کہتا ہے۔ میں رزّاق ہوں اور میں ہوں کہ نانِ شبینہ کو
بھی محتاج ہوں۔ اگر خُدا ہوتا تو اپنے بندے کو یُوں عاجز نہ بناتا۔ یہ تھے
وہ واقعات و حالات جن میں یہ خدا سے ناراض ہوئے۔ خدا کے مُنکر تو آج
بھی نہیں۔ زُبان سے کچھ ہی کہتے رہیں مگر خدا کے وجود کا اقرار قدم قدم پر
کرتے ہیں۔ اُس وقت بھی کیا جب یہ افتاد پڑی تھی ؎

اس تلاطم میں ہم ادیبوں کی
کیا ضرورت تھی ایزدِ باری

جوش صاحب خدا سے ناراضی کا ایک اور واقعہ بھی سُنایا کرتے ہیں:

میں ایک دن صبح ہی صبح سیر کے لیئے نکلا کہ دیکھتا ہوں ایک بڑھیا، پھٹے حالوں، لاٹھی ٹیکتی چلی آ رہی ہے۔ مجھے ترس آیا۔ میں نے جیب سے ایک روپیہ نکال کے دیا۔ اُس نے لینے سے انکار کر دیا۔ کہا۔ "ابھی میری بہن زندہ ہے۔ وہ مجھے پانچ روپے مہینہ گزارہ کے لیے دے دیتی ہے۔ جیسے تیسے گزارہ کر لیتی ہوں۔ جس دن وہ مر گئی۔ اُس دن شاید مانگنے کی بھی نوبت آ جائے مگر ابھی نہ لوں گی۔"

"میں نے سوچا۔ کتنی خوددار ہے یہ بڑھیا۔ اس کی حالت پر مجھے ترس آ رہا ہے مگر رب العالمین کو ترس نہیں آیا تھا۔ اس بات نے مجھے خدا سے بغاوت پہ آمادہ کیا۔ وہ دن اور آج کا دن، اپنی خدا سے نہیں بنی۔"

ایک دن یہ خدا کے بارے میں" اپنے ایسے ہی" ارشاداتِ عالیہ" سے حاضرین کو مستفید فرما رہے تھے کہ ـــ "جہالت کی کوکھ سے خدا کا وجود ظہور میں آتا ہے" ـــ اس پر میں نے کہا۔ "جوش صاحب! اگر خدا سچ مچ نکل آئے تو پھر آپ کا کیا بنے گا؟"

کہنے لگے۔ "ایسی صورت میں اللہ میاں مسکا کے بغل گیر ہو جائیں گے اور کیا ہو گا۔ خدا جسے ہم سب رحیم اور کریم کہتے ہیں۔ وہ یقیناً ظالم نہ ہو گا کہ اپنے بندوں سے انتقام لے۔"

یہ عام آدمیوں سے ذرا مختلف طریقوں سے سوچتے ہیں۔ خطا ہے تو اتنی!

اگر مندرجہ ذیل واقعہ کسی اور کے ساتھ پیش آیا ہوتا تو وہ نہ جانے خود کو ولایت کی کونسی منزل پر پہنچا دیتا۔ کہتے ہیں۔ عرصہ ہوا میں نے ایک نعت لکھی تھی بڑے ہی جذب کے ساتھ، اُسی رات خواب میں ایک بزرگ شخصیت کو دیکھا۔ احساس ہوا، رسول اللہ ہیں۔ کمرہ بھی معطر ہو گیا۔ معاً جاگ اُٹھا تو مجھے کمرہ ویسا ہی معطر ملا۔ خوشی اور حیرت کے ساتھ بیگم کو آواز دی۔ وہ آئیں تو کہنے لگیں۔ کمرہ بڑا معطر ہے۔ اس کے بعد میں نے نوکر کو آواز دی۔ وہ آیا تو وہ بھی کہنے لگا کہ کمرے سے خوشبو آ رہی ہے۔

میں سوچنے لگا کہ آخر ایسا ہوا کیوں؟ میری سمجھ میں یہی بات آئی کہ یہ سب میرے ہی تنفس کا تعطر تھا اور اس میں کوئی کراماتی یا روحانی پہلو نہ تھا۔

واقعی اگر یہی خواب کسی مولوی کو آ جاتا اور یہی کچھ وہ محسوس کرتا تو وہ اپنا بھی دماغ خراب کر بیٹھتا اور اوروں کا بھی!

جس حیدرآباد سے یہ نکلے وہاں جانے کا وسیلہ عماد الملک بنے۔ اُنھوں نے ہی نظام سے انھیں روشناس کرایا تھا۔ عماد الملک نے یہ کہہ کر ان کی تعریف کی کہ اس وقت جوش ہی ہندوستان کا منفرد شاعر ہے جو اپنے اندر جان رکھتا ہے اور یہ بھی کہا کہ میں نے آج تک کسی شاعر کی تعریف نہیں کی مگر مجھے جوش کے کلام نے اتنا متاثر کیا ہے کہ آپ سے عرض

کروں کہ انھیں یہاں بہ طور خاص بلایا جائے۔ اس وقت عماد الملک کی بڑی پوزیشن تھی اور جوش صاحب اتنے بڑے شاعر تھے۔ بس منارروں پہ کمند پھینکنے والے ایک اُبھرتے شاعر تھے۔ چنانچہ ان کا تقرر نظام کے حکم سے ہُوا۔ کوئی جگہ نہ تھی مگر انھیں (بقول شاہد احمد دہلوی) انگریزی ادب کے شعبۂ تراجم میں دھانس دیا گیا۔

بعد میں تو حیدر آباد میں ان کا خوب طوطی بولا۔ امرا دوستانہ یوں ایسے ملتے تھے جیسے وہ کوئی ان کے دبیل ہوں۔ ماتحت ہوں۔ نظام کے یاں بھی انھیں درباری ضابطوں کی رعایتیں تھیں۔ مثلاً نظام کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے ایک خاص قسم کے لباس کی ضرورت تھی جس سے جوش صاحب مستثنیٰ تھے ——— اور پھر یہ واقعہ بھی اُسی حیدر آباد میں پیش آیا کہ جب یہ نظام کے حکم سے پندرہ دن کے اندر اندر حیدر آباد چھوڑنے پہ مجبور ہوئے تو وہ لوگ جو اُنھیں روزانہ گھیرے رہتے تھے اور ان سے سو طرح کے فائدے اُٹھاتے تھے۔ وہ سب کے سب پر لگا کے اُڑ گئے۔ جس وقت اُنھوں نے حیدر آباد کو چھوڑا اس وقت اسٹیشن پہ ایک شخص بھی خدا حافظ کہنے والا نہ تھا۔

نظام کے منجھلے لڑکے معظم جاہ سے ان کے بڑے تعلقات تھے۔ پہلے یہ پینے تو تھے مگر اتنے باقاعدہ نہ تھے۔ وہاں کی روزانہ نشست میں

روزانہ چلی اور خوب چلی۔ معظم جاہ باوا جان کے چھینے بیٹھے تھے۔ چنانچہ اُس عالم میں اُن کے مُنہ میں جو آتا کہہ گزرتے۔ وہ کہتے باوا جان کنجوس ہیں۔ تو یہ کہتے۔ ارے کنجوس؛ مہا کنجوس۔ وہ کہتے باوا جان بڑے تھرڈ کلاس انسان ہیں۔ تو یہ کہتے تھرڈ کلاس، اتنا چھوٹا آدمی تو آج تک پیدا ہی نہیں ہوا۔

نشے ہی کی حالت میں معظم جاہ نے کہا "اچھا تو پھر باوا جان پر نظم ہو جائے۔"

اُنھوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے اور اسی حالت میں نظم فرما دی۔ وہ تو تھا بیٹا۔ اس لئے چھوٹ نہ سکا یہ تھے شاعر، دھکیل دیئے گئے۔

ہاں صاحب! شراب پینے کا تو لطف ہی یہ ہے کہ خود بھی بہکے اپنے ہم نشینوں کو بھی بہکائے۔ انشا نے جو کہا ہے "تو بھی بہک مجھے بھی بہکا" تو کچھ غلط نہیں کہا۔

جوش صاحب نے بھی حیدرآباد سے بھاگنے کی بابت کچھ یوں بتایا تھا:

"ہم نے نواب کی ملازمت جتنا عرصہ بھی کی خوش نہ رہے بلکہ اپنی بدبختی پہ، گھر آکر اپنی بیوی کے سامنے رویا کرتے تھے۔ نواب کی سی آئی ڈی زوروں پہ ہوتی تھی۔ کسی نے بات نواب صاحب تک پہنچا دی کہ جوش صاحب آپ کی نوکری کو اپنی بدبختی کی علامت سمجھتے ہیں۔ اور گھر جاکر رو دیا

کرتے ہیں۔

دوسرے ہم نے نواب کے خلاف نظم لکھ ڈالی اور اسے امراء اور وزراء کی محفل میں پڑھ ڈالا۔ سب سناٹے میں آ گئے۔ مجھ سے کہا جوش صاحب یہ آپ نے کیا غضب کر دیا۔

مجھے اپنا انجام نظر آ رہا تھا۔ اس لئے میں نے استعفیٰ لکھ کر بھیج دیا کہ مجھے نوکری سے سبکدوش کر دیا جائے۔ جنگل کی آگ کی طرح، ایک ہی دو گھنٹوں میں میرا استعفیٰ نواب صاحب تک پہنچ گیا۔ نواب صاحب اور بھنائے کہ ایک تو ہمارے خلاف نظم پڑھی۔ الٹا استعفیٰ لکھ کر بھیج دیا۔ یعنی برطرف کرنے کا حق بھی ان کے استعفیٰ نے باقی نہیں چھوڑا۔ کسی نے مشورہ دیا کہ لکھ دیجئے استعفیٰ منظور اور پندرہ دن کے اندر خارج البلد کیا جاتا ہے۔ اس پر نواب صاحب خوش ہوئے کہ ہاں ہاں بات بن گئی۔

جوش صاحب کہتے ہیں کہ میری اتنی گستاخی پر بھی نواب صاحب یہ چاہتے تھے کہ ہم کسی طرح سے معافی مانگ لیں اور نوکری بحال کر دی جائے مگر میں نہ مانا اور میں نے حیدرآباد کو خیرباد کہہ دیا حالانکہ میرے دوست، میری بیوی کہتی تھی۔ نوکری کا معاملہ ہے معافی مانگ لیجئے۔ مگر میں نے اپنی خودداری کو چند سکوں کے عوض نہ بیچا۔"

اب یہ روزانہ پیتے ہیں۔ باقاعدگی سے پیتے ہیں۔ گھڑی سامنے رکھ کر پیتے

ہیں۔ گھڑی اتنی باقاعدہ نہیں چلتی جتنے یہ باقاعدہ چلتے ہیں۔ ایک بار جب
گاندھی جی نے انھیں شام کا وقت ملنے کے لئے دیا تو انھوں نے کہا "گاندھی
جی کوئی اور وقت دیجئے۔ یہ وقت تو میرے شراب پینے کا ہے۔"

جوش صاحب کے جو دوست شراب نہیں پیتے۔ ان پر یہ پھبتیاں کستے
ہیں۔ نابالغ قرار دیتے ہیں۔ بچہ پارٹی کہتے ہیں۔ ان باتوں سے یہ معلوم ہوتا
ہے کہ جیسے جوش صاحب پینے کو برا نہیں سمجھتے مگر جب بیٹے نے پینی شروع
کردی تو انھیں دلی صدمہ ہوا۔ کہا "وہ منحوس گھڑی تھی جس میں میں اس نابکار کا
شکار ہوا تھا۔ مگر میں نے تو اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ مگر سجاد کا کیا ہوگا؟"

ابھی ابھی بھٹکنے اور بہکانے کے سلسلے میں انشا کا ذکر آیا تھا۔ انشا کے
ذکر سے ایک اور بات ذہن میں ابھرتی ہے کہ اردو شاعری کے افق پر انشا
نہ ابھرا ہوتا تو جوش پیدا ہی نہ ہوتے۔ یہ انشا نامی شخص بھی کیسے کیسے الفاظ
کو روندکر آگے بڑھا۔ نئے نئے الفاظ گھڑنا، نئی نئی تشبیہات تراش لینا، جوش
کے ہاں ورثہ ہے انشا کا، جوش کی قادر الکلامی مسلّم، مگر جوش کے مصرعوں میں
انشا جھانکتے ہیں۔ میں جوش کو انشا سے بڑا شاعر سمجھتا ہوں مگر یہاں ذکر
اُس ذہنی غذا کا ہے جو انشا کے توسط سے جوش تک پہنچی۔

میں نے یہاں انشا اور جوش کا بلا وجہ موازنہ کر ڈالا۔ ایسا صرف
میں نے ایک نکتے کی وضاحت کے لئے کیا ہے۔ ویسے میں میر و غالب

کے گزرے، دوسرے شاعروں کو ناپنے کا قائل نہیں ہوں۔ اس لئے میں آپ سے بھی کہوں گا کہ آپ جوش کو جوش کی حیثیت سے اور انشا کو انشا کی حیثیت سے نا پیں۔ یہ دونوں صرف ایک پڑاؤ پہ اکٹھے نظر آتے ہیں۔ ورنہ شعری زندگی کے میدان میں دُور دُور کھڑے ہیں۔

جوش صاحب کو شاعر انقلاب مان لیا گیا ہے مگر میں انھیں شاعر جمالیات ہی سمجھتا ہوں۔ اس لئے کہ شاعر انقلاب اگر کوئی ہوا ہے تو وہ صرف نذرالاسلام ہے۔ ہاں کسی حد تک اقبال کو بھی شاعر انقلاب کہا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ اقبال نے سوچے سمجھے انداز میں انقلاب آسا شعروں کو الاپا، مگر جوش نے جوش میں آکر بھی ایسا نہیں کیا۔ گھن گرج اور توڑ پھوڑ والی شاعری تعمیری نوع کی انقلابی شاعری نہیں ہو سکتی۔ اقبال کے ہاں بھی انقلابی شاعری کا صرف جسم ملتا ہے روح نہیں ملتی۔ انقلابی شاعری کی روح اگر کسی کے ہاں ہے تو وہ صرف نذرالاسلام ہے۔ اقبال بنیادی طور پر صرف شاعر ملت ہیں۔ اس میں ان کے ہاں جسم بھی ہے روح بھی ہے۔

انقلاب ذہنوں کو کتنا ہی لبھائے مگر وہ کلیتہً تعمیری نہیں ہوتا۔ تعمیری ارتقا تو ایک تدریجی عمل کا نام ہے جس سے فکر و عمل کا ایک مخصوص سانچا تشکیل پاتا ہے اور انقلاب محض بدنظمی ہے جس سے بگاڑ کے تو بہت سے پہلو نکلتے ہیں مگر بناؤ کی کوئی صورت نہیں نکلتی۔

یہ ٹھیک ہے کہ محض داخلی شاعری پوری شاعری نہیں ہوتی۔ خارجی شاعری کی چاشنی کے بغیر پورا شاعر ہونا نظریاتاً ناممکن ہے۔ جوش کے یہاں یہ دونوں پہلو ہیں مگر مصیبت یہ ہے کہ کبھی ان پر خارجی شاعری کا ظہور ہوتا ہے اور کبھی داخلی کا۔ دونوں چیزیں بیک وقت اور ایک ہی تخلیق میں ان کے یہاں نہیں ملتیں یا کم ملتی ہیں۔ ایک اعتبار سے یہ بات اچھی بھی ہے کہ ان کی تخلیقات کا ایک موڈ اور ایک آہنگ ہوتا ہے۔ یہ نظم کو غزل کی طرح ملغوبہ بنانا نہیں چاہتے۔ ویسے یہ الگ بات ہے کہ آج کل ان کی چھوٹی چھوٹی سی اور پیاری پیاری سی جو نظمیں سامنے آرہی ہیں وہ کچھ غزلِ مسلسل ہی کے سے انداز کی ہیں جیسے "دعوتِ سفر" اور "مقدمِ بہار"

غزل کے بارے میں ان کے تاثرات تو آپ نے سنے ہی ہوں گے۔ ایک حکایت یہ بھی ہے۔ الفاظ بھی انہی کے ہیں:

"ایک مرتبہ دہلی میں جگر، فراق وغیرہ سے غزل کے متعلق بحث ہو گئی۔ انھوں نے پوچھا "آپ غزل کے اتنے مخالف کیوں ہیں؟" میں نے جواب دیا "یہ میں اس وقت نہیں کل صبح آپ کے ہوٹل میں آکر بتاؤں گا۔ چنانچہ دوسرے دن صبح پیدل وہاں پہنچا۔ انھوں نے پوچھا "جوش صاحب اتنی دیر کہاں لگا دی؟" میں نے کہا "قبلہ! کیا عرض کروں۔ کوئی سواری نہیں ملی۔ پیدل چلتے چلتے پاؤں میں چھالے پڑ گئے اور جواہر لعل کا بیان مجھے بڑا پسند آیا۔ ویسے

اسٹالن قابل آدمی تھا اور پکاسو کا آرٹ میری سمجھ سے باہر ہے مگر تیر کا
کلام سراپا الہام ہے۔کل جو پٹنہ کے قریب گاڑی لڑی ہے اتنا بڑا حادثہ
میں نے کبھی نہیں سنا"۔ ابھی کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ جگر نے بیچ میں ٹوک کر
کہا" جوش صاحب! آپ کیا اول فول بک رہے ہیں" میں نے
جواب دیا" حضور اول فول نہیں بک رہا ہوں غزل کہہ رہا ہوں"

ان میں ایک بات اور عجیب دیکھی کہ آپ غزل کے بڑے دشمن
ہیں لیکن شعر و شاعری کے سلسلے میں جب کسی سند کی ضرورت پیش آئے گی
تو پڑھیں گے غزل کے شعر، آپ خدا کے بھی خلاف ہیں لیکن قدم قدم
پر خدا کے وجود کا بھی اقرار کرتے جائیں گے۔ اب ان کے بارے میں
کوئی فیصلہ کرے تو کیا کرے ــــ واقعی یہ ایک چکرا دینے والی شخصیت
ہیں (جگر کے انتقال کو ابھی تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ میں نے ان سے استفسار
کیا)" جگر کی شاعری کے بارے میں حضور کی رائے کیا ہے؟"

" اپنا مسلک چھوڑ دوں تو بات کروں۔ یہ تو آپ کو علم ہی ہے کہ میں
صنفِ غزل کے خلاف ہوں اور جگر غزل کے شاعر تھے"

" آپ اپنے مسلک سے تھوڑی دیر کے لئے ہٹ جائیں"
" یہ بات ہے تو جگر غزل کے بڑے اچھے شاعر تھے۔ بڑا رچا ہوا مذاق
پایا تھا۔ ڈوب کر کہتے تھے مگر آخری دنوں میں جذبے کی وہ شدت نہیں

رہی تھی۔"

"یہ بات تو نہیں۔ ان کی آخری دور کی شاعری میں، زیادہ غور و فکر ملتا ہے۔ زیادہ جان دار غزلیں ملتی ہیں۔"

"یہ بات تو ٹھیک ہے مگر وہ والہانہ پن جاتا رہا جیسے ؎

میں اپنا جام اٹھاتا ہوں تو کتاب اٹھا

دوسرے جگر کے ساتھ فراق بھی غزل کے شاعر ہیں۔ فراق کے ہاں WIT زیادہ ملتی ہے اور جگر کے ہاں تغزل۔"

میں نے شرارتاً کہا۔ "جگر کے ساتھ فراق کا نام نہ لیں۔ فراق تو شعر کہتے چلے جاتے ہیں خواہ وہ بحر میں ہوں یا نہ ہوں۔"

"فراق بحر کے نہیں لہر کے آدمی ہیں مگر دونوں کا اپنا اپنا مقام ہے اور بڑا اونچا مقام ہے۔ بہرحال جگر کے انتقال سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تنہائی میں اضافہ ہو گیا ہو۔"

میں نے کہا۔ "آپ کو چاہیے کہ ان پر ایک بھرپور مضمون لکھیں۔"

"ہاں لکھوں گا۔ میں جو اپنی سوانح (یادوں کی برات) لکھ رہا ہوں۔ اس میں اپنے سارے دوستوں کا ذکر تفصیل سے کروں گا اور اس میں اپنے اٹھارہ معاشقوں کا بھی ذکر کروں گا۔"

"سب کچھ سچ سچ لکھ دیں گے؟"

"فی الحال تو شاعری کروں گا مگر لکھ کے رکھ جاؤں گا۔ کہہ دوں گا کہ میرے مرنے کے بعد وہ حصّہ بھی شائع کر دیا جائے۔"

"ہمت ہے تو ابھی چھپوا ڈالیے نا۔"

"بھئی میرا تو کچھ نہیں جن کا ذکر کروں گا ان کے لیئے مصیبت ہو جائے گی۔ ان کے شوہر پوچھیں گے — اچھا تو تو جوش کے ساتھ پھنسی ہوئی تھی۔"

دوسری مرتبہ جب میں دلّی گیا تو جوش صاحب اپنے کمرے میں نہ تھے ایک صاحبہ تشریف فرما تھیں۔ وہ بار بار گھر پہ ٹیلیفون کر کے معلوم کرنا چاہ رہی تھیں کہ جوش صاحب گھر پہ ہیں یا نہیں۔

وہیں بیٹھے بیٹھے جب ٹیلیفون کی گھنٹی بجی تو میں نے ریسیور اٹھایا۔ آواز آئی "یہاں کون صاحبہ بیٹھی ہوئی ہیں؟"

میں نے کہا "مجھے تو معلوم نہیں کہ کون ہیں مگر آپ کون بول رہی ہیں؟"

جواب ملا "میں بیگم جوش بول رہی ہوں۔"

اس پر میں نے کہا "بھابی آداب عرض!"

بیگم جوش نے اس وقت نہ جانے مجھے جوش صاحب کا کونسا دوست سمجھ کر یہ کہا "جوش صاحب کے کیریکٹر کا خیال رکھنا آپ لوگوں کا کام

ہے ۔ میں تو گھر میں رہتی ہوں ۔ مجھے کیا پتہ کہ وہاں کیا گلچھرّے اڑا رہے ہیں"۔

اب میں ان کے گلچھرّوں کا جواب کیا دیتا ۔ چُپ ہو رہا ۔

جوش صاحب نے ایک جگہ اپنے اوّلین عشق کا حال مزے لے لے کر بیان کیا ہے ۔ دلچسپی ہو تو اسے پڑھ لیں ۔ اللہ والے ہوں تو دو ایک ورق اُلٹ کر آگے چل دیں :

" فراغت کی ریل پیل اور رنگ رلیوں کا دور دورہ تھا ۔ اس لیئے کیسے ممکن تھا کہ میری " مونچھوں کے کونڈے " کا جشن بڑے دھوم دھڑکے سے نہ منایا جاتا ۔

تفصیلات سے قطع نظر کر کے صرف دو مجروں کا حال بیان کرنا چاہتا ہوں :

رات ہوتے ہی جگ مگ جگ مگ کرنے والے شامیانے میں علی جان کاشمیری نے جب قدم رکھا تو سب کی نگاہیں اُس کے چہرے پر یوں گڑ کر رہ گئیں گویا ہر نظر میں ایک زنجیر ڈال دی گئی ہے ۔

علی جان ، نامِ خدا ، خوب رُو ، خوش گلو ، شیریں حرکات اور کم سن کاشمیری تھا جس کے چہرے کی شکر میں تھوڑا سا نمک بھی گھلا ہُوا تھا اور اس وجہ سے جب وہ اپنے چہرے کی ممزوج آب و تاب کے ساتھ نقابوں کے حلقے سے نکل کر سامنے آیا تو ایسا محسوس ہُوا کہ پلکے سے کہرے کی چھاؤں

میں صبح بنارس طلوع ہو رہی ہے۔

سامنے آتے ہی پہلا وار اُس نے یہ کیا کہ اپنے گھنگروؤں کی جھنکار میں تُلے ہوئے اعضا کے لوچ کے ساتھ کولہے پر ہاتھ رکھ لیا اور کولہے پر ہاتھ کے جمتے ہی ایسا نظر آیا جیسے کوئی ہوا پر رقص کرنے والا کبوتر چھتری پر آ کر بیٹھ گیا یا دریا کے ناؤ پر ایک لچکیلا پُل تعمیر کر دیا گیا۔ کولہے پر ہاتھ رکھتے ہی ہرنت کو انگڑائی آئی اور یکایک علی جان نے اپنی سرمئی اور وحشی آنکھوں کو آدھا بند کر کے اپنی صراحی دار گردن کے ڈورے کو یوں ہلانا شروع کر دیا جیسے حبس کے عالم میں ٹھنڈی ہوا دفعتہً سنکنے لگی ہے یا چاند کے اُبھرتے ہی دریا کی نبضیں چلنے لگتی ہیں۔ گردن کا ڈورا ہلتے ہی سارنگیوں کے گز ایک دردآمیز، نشاط آمیز جھنجھناہٹ کے ساتھ درخشاں تاروں پر یوں کروٹیں بدلنے لگے جیسے برکھا کی برستی دھمکتی راتوں میں کسی برہا کی ستائی الھڑ کے ارمان مچلنے لگتے ہیں۔

الامان ایسے لمحے کی، دل پر ضرب مارنے والی ٹھمک، سارنگیوں کی خون میں تیرنے والی جھن جھن، مجیروں کی رگوں میں چٹکیاں لینے والی کھن کھن اور بجتی تلی سازوں کی دھاروں پر آڑی تالیوں کی گونج، ان سب نے ہم آہنگ ہو کر ایک گنگناتا متحرک منظر پیش کر دیا۔ گویا کسی خواب کے جزیرے سے پریوں کی برات گزر رہی ہے۔ علی جان کا مجرا ختم ہوا تو دیر تک سناٹا

بجتا رہا۔

اس کے بعد چار طوائفیں مجرے کو آئیں۔ رنگ جما نہ سکیں۔ ہر مجرا پھیکا پھیکا سا رہا۔

البتہ جب پانچویں طوائف چمکتی آئی۔ ناک میں چھوٹی سی نتھنی، کانوں میں انیاں، گلابی ساری، شہابی مکھڑا، تو دیکھنے والوں کی نگاہیں الف ہونے لگیں۔ بزرگوں نے خوردوں سے نظر بچا کر کن انکھیوں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اُن کی آنکھوں کے حلقے میں بالوں کی سفیدی کا غم چکر کھانے لگے اور آسمانوں سے یہ صدا آنے لگی کہ:

ابیت کہ دل بُردہ و خوں کردہ بسے را

بسم اللہ اگر تابِ نظر ہست کسے را

اس کافرہ نے ابھی مشکل سے زندگی کی پندرہ سولہ بہاریں دیکھی تھیں۔ اور اس کی بے چکل جوانی میں وہ زور تھا جیسے کوئی اُس کو نیچے کی طرف ریلے دے رہا ہے۔

وہ ہری کونپل اور مدھ ماتی الھڑ، راگ، نرت اور ناچ میں ابھی خام تھی۔ لیکن اس کی کچی جوانی کا رس، اس کی خامی کو یوں سہارا دیئے ہوئے تھا گویا کرشن جی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر رادھا مشقِ خرام کر رہی ہے۔

جب نرت کے دوران میں اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر اپنے

سر پر رکھ لیا تو ایسا دکھائی دیا جیسے کالی زلفوں کے اوپر دھنک نکلی ہوئی ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ اُس نے دادرا چھیڑا تو سازے گاما کی چلت پھرت اُس کے گلے کے کورے پن میں گھومنے لگی جیسے تیز ہوا کی رو میں دھان کے کھیت سرسرانے لگتے ہیں اور جب گاتے گاتے، ناچتے ناچتے وہ میرے قریب آئی اور یکایک جھک گئی تو ایسا محسوس ہوا گویا گلاب کی نرم ٹہنی چٹ سے ٹوٹ کر دوہری ہو گئی۔

اور آخر کار جب داد کی خاطر وہ عین میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی تو اس کے کم سنی کے مہکتے ہوئے کورے بنڈے کی لپٹوں نے میرے تمام وجود کا احاطہ کر لیا اور اس کے ساتھ ساتھ جب اُس کی زرتار پیشواز کے نرم ہیرے نے میرے ہاتھ کو دفعتہً چھو لیا تو اس لمسِ اوّلین نے ایک ایسا تازیانہ مارا کہ میرا خون بلّیوں اُچھلنے لگا۔

یہ میری زندگی کا اوّلین عشق تھا، نا معلوم و نیم محسوس!
یہ سب سے پہلا عشق، آدھی رات کی شبنم کے مانند گرا اور میرے خوابیدہ وجود میں جذب ہو کر مجھ سے کچھ کہے سُنے بغیر، گونگے کی طرح رخصت ہو گیا۔ لیکن آگے چل کر اُس نے بڑے گُل کھلائے اور میری کشتِ حیات میں عشق کے بہت سے درخت پیدا کر دیئے۔ آج بھی جب میں اپنے اس

بائیں ہاتھ کی پشت پر نظر ڈالتا ہوں تو اس کی ماہ وسال کی اُبھاری ہوئی موٹی موٹی رگوں اور اُس کی درازیِ عُمر کی بنی ہوئی جھرّیوں کے نیچے وہ شامیانہ، وہ جشن، وہ مکھڑا اور پیشواز کا وہ لمس شیریں اب بھی نظر آجاتا ہے اور دل سے خُون کی بُوندیں ٹپکنے لگتی ہیں۔

رہے نام اللہ کا!"

یہ تھا جوش صاحب کے عشقوں کا "ابتدائیہ"، میں جوش صاحب کے اس پہلے عشق پر اس لیے ایمان لے آیا ہوں کہ بغیر شدید جذبے کے اس قسم کی تحریر ممکن ہو ہی نہیں سکتی۔ واہ وا! کیا خوبصورت نثر لکھ گئے۔

یہ دوستوں سے وعدہ خلافی یا اُن کے جا و بے جا تقاضوں سے بچنے کے لئے بیوی کی تُند مزاجی کی بھی پناہ لیتے ہیں۔ دوستوں میں بیٹھ کر جب بیوی کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیتے ہیں۔ عموماً یہ کہتے ہیں کہ یہ سب کی سب بیویاں، بڑے بڑے جابر بادشاہوں مثلاً فرعون، چنگیز خاں، ہلاکو اور نیرو کی بہو ہوتی ہیں۔

یہ واقعہ تو ہے کہ یہ شاعر انقلاب اپنی بیوی سے بڑا ڈرتے ہیں۔ کچھ ان کی کمزوریاں ہیں جن کی وجہ سے انھیں ڈرنا پڑتا ہے۔ کچھ وہ سخت گیر ہیں جن کی وجہ سے ان کی گھگھی بندھی رہتی ہے۔ یہ ہر وہ بات جو بیوی سے چھپانے والی ہوتی ہے چھپاتے ہیں۔ . . . .

. . مگر یہ بیوی سے چھپانے والی باتیں اس تواتر سے کرتے ہیں کہ وہ چھپ نہیں سکتیں۔ اس لیے ان کی کتنی دبتی رہتی ہے اور وہ شیرنی سے شیرنی تر ہوتی چلی جا رہی ہیں۔

ان کے بھائیوں میں، اولاد میں، کوئی ایسا نہیں ہے جسے جوش صاحب سے تھوڑی بہت نسبت دی جا سکے۔ ان کا خیال ہے کہ جب کوئی جی نی اَیس پیدا ہوتا ہے تو وہ اوپر کی اور نیچے کی دو تین پشتوں کی ذہانت کو نچوڑ لیتا ہے

جوش صاحب سگریٹ کبھی کبھار پیتے ہیں مگر سگار اور حقہ برابر پیتے رہتے ہیں۔ پچھلے برس لاہور آئے تو ایک حقہ بھی خرید فرما لیا۔ کہتے تھے کہ کراچی میں یہ حقہ پچپن روپے کا ملتا ہے۔ یہاں بائیس روپے کا ملا ہے۔ لاہور والے بڑے شریف لوگ ہیں (پھر مزاحاً) اسی سے اندازہ لگا لیجئے کہ لاہور میں طفیل رہتا ہے اور کراچی میں جوش۔"

جوش صاحب نے حقہ خرید کر تانگے میں رکھوایا اور خود کو اس زاویے سے رکھا جیسے تصویر کھنچوانے کا ارادہ ہو۔ جبھی میں نے کہا تھا کہ اس وقت آپ کا ارادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ "کوئی آپ کی تصویر لے لے۔"

"ہاں بھئی ہاں، اگر کوئی اس وقت میری تصویر لے لے تو مجھے بڑی خوشی ہو۔ مگر یہ حقہ والی بیماری ہماری خاندانی ہے۔ میرے والد صاحب بھی جب باہر نکلتے تھے تو وہ بھی گاڑی میں حقہ رکھوا لیتے تھے۔ میں ان سے ذرا

مہذب ہوں ۔ اس لیے کہ میں حقہ صرف گھر پہ پیتا ہوں ۔

راستے میں مجھ سے پوچھا " یہاں پر پرآن کا بھی ایک ہوٹل ہوتا تھا۔ تقسیم سے پہلے میں اس کے پاس ٹھہرا کرتا تھا۔ اب وہ غریب دلّی میں ہے اور بُرے حالوں میں ہے ۔ اُس ہوٹل سے میری بڑی یادیں وابستہ ہیں ۔ فلاں فلاں اور فلاں میرے پاس ہوٹل میں آیا کرتے تھے ۔ اُن دنوں لاہور میں سعیدہ نامی ایک رنڈی تھی ۔ بڑا عمدہ گاتی تھی اور پھر ـــــ "

میں نے عرض کیا " اور پھر کے آگے بھی کچھ کہئے ۔"

" معلوم ہوتا ہے ۔ تم بڑے کُند ذہن ہو ۔"

ادبی دُنیا کے سامنے جوش صاحب کا باقاعدہ تعارف، سب سے پہلے بڑی فراخ حوصلگی کے ساتھ مولانا عبدالماجد دریابادی نے کرایا تھا۔ "رُوحِ ادب" پر "معارف" میں بڑا اچھا تبصرہ کیا ۔ مولانا اُن دنوں اپنے دلکش اور فلسفیانہ مضامین لکھنے کی وجہ سے بڑے ہی ہردلعزیز تھے ۔ یہ وہ وقت تھا کہ مولانا نئے نئے مسلمان ہوئے تھے ۔ یعنی ان کا الحادی دور ختم ہو چکا تھا، جب کوئی نیا نیا مسلمان ہو تو وہ دو ہزار رکعت پڑھنے کو بھی کوئی بڑی بات نہیں سمجھتا ۔ پھر ایسے زاہد، جو ہر وقت مثنوی مولانا روم بغل میں رکھتے ہوں ۔ وہ اگر اس رندِ خراباتی کی تعریف کریں تو اپنی جگہ بات کچھ کم اہم بھی نہ تھی ۔

بات یہ ہے کہ مولانا ماجد علم اور ادب کے راستے سے مذہب کی طرف لوٹے تھے۔ اس لیے اُنھوں نے ادیب کو ادیب کی حیثیت سے پہچانا۔ آج مولویوں کا دکاندار طبقہ ادب کو جس طرح مسلمان بنانے کی فکر میں ہے اس میں ادیب کے ساتھ انصاف کیا ہی نہیں جا سکتا

مولانا ماجد ہی نے سب سے پہلے اُنھیں مصورِ جذبات لکھا اور شاعرِ انقلاب مولانا ظفر علی خاں نے کہا۔ شبابیات پر لکھا تو یہ شاعرِ شباب بھی بنے۔ اُنھیں سب سے پہلے شاعرِ شباب کس نے کہا۔ اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔

جوش صاحب جھگڑے کو پسند نہیں کرتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ چند بے تکلف دوست ہوں تاکہ ہر گفتہ اور ہر ناگفتہ بات کہی جاسکے۔ باتیں کرنے کی حد تک، شعر سنانے کی حد تک، ان کی نگاہیں صرف بے تکلف دوستوں کو ڈھونڈھتی ہیں۔ حاضرین میں غیر مانوس شکلیں ہوں گی تو انھیں شعر سنانے میں ہچکچاہٹ ہوگی۔ بعض اوقات غلط قسم کے ماحول میں کلام سنانے سے صاف انکار کر دیتے ہیں۔ اصرار ہوگا تو ایسے جملے بھی کہہ گزریں گے جو دلآزاری کے ذیل میں آتے ہوں۔

ایک دفعہ یہ اپنے چند بے تکلف دوستوں میں بیٹھے چہک رہے تھے، لہک رہے تھے۔ بڑے اچھے موڈ میں تھے اور اپنا کلام ترنم سے سنا رہے تھے (ان کا کلام گھن گرج والی آواز میں تو سب نے سُنا ہوگا مگر ترنم کے

ساتھ سُننے کا اتفاق کبھی کبھار ہی ہوتا ہے)

ایسے میں دو تین صاحب آن وارد ہوئے جن سے جوش صاحب واقف نہ تھے۔ پہلے تو عینک میں سے اُن حضرات کو بڑے غور سے دیکھا جب اُنھوں نے السلام وعلیکم کہا تو اُنھوں نے بڑے زور سے لاحول و لاقوۃ! کہہ کر اپنی بیاض بند کر دی۔ تھوڑی دیر کے بعد حاضرین میں سے کسی نے کہا۔ "جوش صاحب چُپ کیوں ہو گئے؟"

پھر کر کہنے لگے "میں اُس وقت تک شعر نہیں سناؤں گا جب تک کہ فاسد مادہ نکل نہیں جاتا۔"

حاضرین میں سے کسی نے کہا "شعر نہ سنائیے مگر اس شعر کا مطلب تو سمجھا دیجیے۔ غالب کے نسخۂ حمیدیہ میں ایک شعر ہے۔"

جوش صاحب نے پوچھا "کونسا بدمعاش شعر ہے وہ!"

شعر ہے :

بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہو گا
قیامت اک ہوائے تند ہے گورِ شہیداں پر

جوش صاحب نے کہا "یہ شعر غالب کا ہے تو ہوا کرے۔ ہم اُس لونڈے سے مرعوب تھوڑے ہوں گے مگر یہ شعر دلالتِ لفظی کے لحاظ سے بے کمزور ہیں دلالتِ لفظی کے اعتبار سے اُس شعر کو کمزور کہتا ہوں جس کا مفہوم میرے

ذہن میں کچھ آئے اور آپ کے ذہن میں کچھ آئے۔ یہ شعر مکمل نہیں ہے مصیبت یہ ہے کہ غالب فارسی میں سوچا کرتے تھے اور اردو میں شعر کہہ دیا کرتے تھے اگر غالب اس شعر کو فارسی میں کہتے تو وہ اپنے مفہوم کو بڑے عمدہ انداز میں بیان کر جاتے مگر تھا ونڈا جی ٹی ایس ---- غالب کے اور بھی متعدد اشعار ایسے ہیں جو نامکمل ہیں جن میں مرزا اپنا مفہوم ادا نہ کر سکے اور ہم لوگ خواہ مخواہ آپس میں ہاتھا پائی ہو رہے ہیں۔"

حیدر آباد کے دوران قیام میں (۱۹۲۴ء، ۱۹۲۵ء) فانی مرحوم نے جوش صاحب کو ایک عجیب سی لت لگا دی تھی کہ یہ گھنٹوں غائبانہ روحوں سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ پہلے کچھ پڑھا۔ دھیان کو یکسوئی بخشی تو روحیں موجود ہو جاتی تھیں۔ اب یہ بیٹھے ان سے مختلف سوال کر رہے ہیں۔

میں نے ان سے پوچھا: "آپ نے کسی شاعر کی روح کو بھی بلوایا تھا؟"

"ہاں غالب کو بلایا تھا۔"

"پھر کیا کیا باتیں ہوئیں؟"

میں نے پوچھا "آپ کا نام؟"

کہنے لگے "غالب مغلوب!"

"میں آپ کے مزار پر گیا تھا۔"

"میرا قیام مزار میں نہیں۔"

"بادہ نوشی کا کیا معیار ہے آپ کے نزدیک؟"

"ارے میاں! ظرفِ لازم۔"

"آزاد انصاری کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟"

"میرے پوتے ہوتے ہیں۔ ہاں! میرے شاگرد کے شاگرد جو ہوئے"

"ساری عمر آپ وصل کی تمنا کرتے رہے۔ اب تو مقصود مل گیا ہوگا۔"

"ارے جوش، ہم تو یہاں بھی یادِ جاناں کے مشغلے میں رہتے ہیں۔"

اس کے بعد میں نے پوچھا "اور کسے بلایا تھا؟"

"تلک کی روح کو بلایا تھا۔ اس نے مجھے سارے جواب ہندی میں دیئے حالانکہ میں ہندی نہیں جانتا۔ ایک دن فانی نے رنڈیوں کو بلایا تھا۔ کسی نے کوئی شکایت نہیں کی۔ سب کہتی تھیں ہم مزے میں ہیں۔"

پھر اس واقعہ پر تبصرہ یوں کیا "یہ سب فریب ہی فریب ہے۔ ہر انسان کے اندر خوابیدہ حالت میں سب کچھ موجود ہے۔ دیکھ لینا۔ کچھ عرصے کے بعد اندرونی علوم کی یونیورسٹیاں قائم ہوں گی۔ استاد بھی اپنے شاگرد کے اندر کی گرہیں کھولتا ہے۔ جس میں زیادہ صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ میر، غالب اور انیس بن جاتا ہے۔ جس میں کم صلاحیت ہوتی ہے وہ نوح ناروی بن جاتا ہے۔

نگار کے صفحات پر جوش ملیح آبادی کے خلاف کچھ نہ کچھ چھپتا ہی رہا ہے وہ بھی زیادہ تر نیاز صاحب کے قلم سے۔ میں یہاں جوش صاحب کا ایک خط (جو نگار ہی میں چھپا تھا) اور ایک اخبار کا تراشا پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں تاکہ ان دونوں کی ناراضی کا تھوڑا بہت پس منظر سامنے آجائے۔ اور اس کے ساتھ ان دونوں کے کرداروں پر بھی روشنی پڑے بشرطیکہ آپ کا بھی ایمان ہو کہ تحریریں بھی صاحبِ مضمون کی باطنی کیفیات کا اظہار ہوتی ہیں۔

خط بھی پڑھیے مگر اس پر جو نوٹ نیاز صاحب کا ہے وہ بھی قابلِ توجہ ہے۔ دیکھیے بڑے آدمی لڑتے بھی ہیں تو کس شائستگی کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں:-

حضرت جوش ملیح آبادی کا ایک طنزیہ شاہکار۔

نثر میں جواہر ریزوں کا ایک عدیم المثال نمونہ

یہ تو تھے عنوان اور ضمنی عنوان! — اب نوٹ ملاحظہ ہو:

روح دبی ایک ہے پاک و شرافت مآب

نظم میں زیرِ حجاب نثر میں بے نقاب

پہلی جولائی ۱۹۵۵ء کی ڈاک سے مجھے ایک لفافہ ملا جس پر میرا پتہ نیاز محمد خاں فتحپوری دفتر نگار لکھنؤ درج تھا۔ دیکھ کر حیرانی ہوئی کیونکہ مجھے نیاز محمد کے نام سے پکارنے والوں میں اب

میری صرف بڑی بہن باقی رہ گئی ہیں جو یہاں نہیں پاکستان میں ہیں
لفافہ کھولا تو ایک مضمون نظر آیا جس کے آخر میں جناب جوشؔ کے
دستخط ثبت تھے۔ اس کو پڑھ کر حیرت مسرت میں تبدیل ہو گئی کیونکہ
مضمون کیا تھا ایک آبشارِ جوا ہر تھا اور بے اختیار سعدؔی کا یہ شعر
زبان پر آ گیا ؎

لبت بدیدم و لعلم بیوفتاد ار چشم
سخن بگفتی و قیمت برفت لولو را

لیکن اس کے ساتھ اس بات کا افسوس بھی ہے کہ ہم اپنی کم مائیگی
کے باعث شایانِ شان اس کی داد نہ دے سکے ؎

میہمانت کہ چوں تو شاہبازے
تشریف دہد در آشیانم

ہمیں اُمید ہے کہ حضرت جوشؔ آئندہ بھی اپنے " انشائے عالیہ "
اور " افکارِ نادرہ " سے اسی طرح نگار کو زیر بارِ کرم فرماتے رہیں گے:

من چہ در پائے تو ریزم کہ خورائے تو بود
سر نہ چیزے ست کہ شائستہ پائے تو بود

نیاز

" ہمارے سپاہیوں میں" یادش بخیر" ایک تھے۔ ستر بہتر برس کے ناتواں لیکن بلا کے تیکھے اور کرڑے، تو مسلم ٹھاکر" اللہ بخشے" ہدایت اللہ خاں اور ہمارے قرابت داروں میں ایک تھے نوجوان قوی ہیکل اور قیامت کے ظرافت پسند خلیل اللہ خاں!

خلیل اللہ خاں آج بھی زندہ ہیں لیکن چونکہ ان کی وہ ظرافت باقی نہیں رہی ہے جو روتوں کو ہنسایا کرتی تھی اور اس بنا پر وہ اب ــــ" وہ دن گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے" کے زمرے میں آچکے ہیں۔ اس لئے ایک تھے خلیل خاں، چنانچہ ایک روز سریع الاشتعال ہدایت اللہ خاں کے غیظ و غضب کا تماشا دیکھنے کی خاطر، ان کے بیڑے کے ایک سپاہی نے ان سے کہا:" ہدایت اللہ خاں تمہاری مونچھوں سے تو چنگاریاں اڑا کرتی ہیں مگر تمہیں اپنے پوتے کی بھی کچھ خبر ہے؟"

" ہم رے پوتے کی کیا بات کرت ہو" (ہمارے پوتے کی کیا بات کرتے ہو) ہدایت اللہ خاں نے خوخیا کر جواب دیا۔ اس پر اس سپاہی نے" اپنی آنکھوں کو ایک خاص انداز سے گھما کر کہا کہ خلیل اللہ خاں تمہارے پوتے کو بڑے باغ کی ہوا کھلاتے پھرتے ہیں۔"

"ہم رے پوتنے کا ہے" (ہمارے پوتے کو ؟) ہدایت اللہ خاں نے، پیچ و تاب کھا کر کہا اور ان کی سفید داڑھی کے بال سپاہی کے کانٹوں کی طرح یکایک کھڑے ہو گئے۔

ابھی ان کے اعصاب کی کھولن کم نہیں ہونے پائی تھی اور ان کے چہرے کی جھریاں آپس ہی میں گتھی ہوئی تھیں کہ اتفاق سے خلیل خاں محل کے پھاٹک پہ نمودار ہوئے اور ہدایت اللہ خاں نے جوانوں کی سی چستی کے ساتھ، معاً کھڑے ہو کر خلیل خاں سے، اپنے ہونٹ چباتے ہوئے پوچھا کہ "کھلیل کھاں ہم تم سے یو پوچھت ہیں کہ یو، تم کا ہم رے کالے پوتے ہیں کا مجا آوت ہے کہ تم اُس سار کہ باگن باگن کی ہوا کھلا ننت پھرت ہو" (خلیل خاں ہم تم سے یہ پوچھتے ہیں کہ یہ تم کو ہمارے کالے پوتے میں کیا مزا آتا ہے کہ تم اُس سالے کو باغوں باغوں کی ہوا کھلاتے پھرتے ہو)

اور قبل اس کے مسکراتے ہوئے خلیل خاں کچھ جواب دیں ہدایت اللہ خاں نے اپنے سوکھے ہاتھ میں لاٹھی بلند کر لی۔ یہ دیکھتے ہی دوسرے سپاہی اور خدمت گار دوڑے اور ایک نے . . . . . اُن کی لاٹھی پکڑ کر کہا "گھاس کھا گئے ہو ہدایت اللہ خاں! اگر خاں صاحب بہادر کو خبر ہو گئی تو جانتے ہو کہ اِس بڑھوتی میں تمھاری

کیا گت بنا دی جائے گی۔"

غرض کہ اُس روز کا یہ ہنگامہ رفت گزشت ہو گیا۔ لیکن ناعاقبت اندیش و کینہ پرور بوڑھا ٹھاکر بھول جانے یا معاف کر دینے والا انسان ہی نہیں تھا۔

چنانچہ اس واقعہ کے دوسرے ہی دن وہ بوڑھا رینگتا اور لاٹھی ٹیکتا ہوا، بڑے باغ پہنچ کر "گاڑے" پہ بیٹھ گیا اور جب اپنی بڑی بڑی مونچھوں کے ساتھ خلیل خاں حسبِ دستور ہدایت اللہ خاں کے کلے پوتے کو لئے ہوئے بڑے باغ میں نمودار ہوئے تو اس پر چھائے ہوتے بوڑھے نے ڈپٹ کر آواز دی کہ "ٹھاڑہو کھلیل کھان، بڑے جی وٹ ہو تو آؤ، اور دو دوئی دوئی ہات کر لیو۔" (کھڑے ہو جاؤ خلیل خاں، بڑے بہادر ہو تو آؤ اور دو دو ہات کر لو)

دادا کا یہ تھرتھراتا نعرۂ جنگ سنتے ہی اُن کا پوتا تو غزالِ وحشی کی طرح چوکڑیاں بھرتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا اور خلیل خاں نے قریب آ کر مسکراتے ہوئے کہا "ہدایت اللہ خاں تم بوڑھے آدمی ہو۔ میں تم پہ کیا ہات اٹھاؤں۔ ہاں تم اپنا حوصلہ نکال لو۔"

"اچھا، بڑے جوان بنت ہو" (اچھا بڑے جوان بنتے ہو)

کہہ کر ہدایت اللہ خاں نے اپنی داڑھی دانتوں میں دبا لی اور اپنی پوری جسمانی و روحانی طاقت کے ساتھ یہ یقین کرکے بھرپور لاٹھی ماری کہ پہلی ہی ضرب میں خلیل خاں کا بھیجا بہتا نظر آئے گا۔

اس "بے پناہ" ضرب کو بڑی ہی آسانی کے ساتھ، اپنی لاٹھی پر روک کر خلیل خاں نے کہا: "فش!"

اس غیر متوقع حیرتِ ذلت آمیز سے بلبلا کر ہدایت اللہ خاں نے ــــ "بھس پھس کیا کرت ہے اور لے (فش فش کیا کرتا ہے اور لے) کا نعرہ بلند کرکے دوسری لاٹھی ماری۔

خلیل خاں نے اس وار کو بھی روک کر کہا: "فش!"

"اے بھس پھس کا کرت ہے اور لے۔ کھٹاخ ــ" "فش!"

"اے پھس بھس کا کرت ہے اور لے۔ کھٹاخ ــ" "فش!"

"اے بھس پھس کا کرت ہے اور لے۔ کھٹاخ ــ" "فش!"

الغرض خلیل خاں کی "فش" اور ہدایت اللہ خاں کی "بھس پھس کا کرت ہے اور لے" نے اس قدر طول کھینچا کہ ہدایت اللہ خاں کا دم پھول گیا۔ اس دم پھولنے میں بھی آخری بار "بھس ــ بھس ــ کا کرت ہے" کہہ کر وہ بے چارے دھڑام سے گر پڑے اور بیہوش ہوگئے۔

منقابلہ تو دلِ ناتواں نے خُوب کیا

سنتے ہیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دُہرایا کرتی ہے۔ چنانچہ بالکل اُسی طرح ایک فتح پوری نیاز محمد خاں عرف "نگار" ایک ملیح آبادی شبیر حسن خاں عرف "نگار باز" بھی بچیس تیس برس تک یہی فنش اور "پھس پھس کا کرتب ہے اور لے" کا کھیل کھیل کر ابھی چند ماہ ہوئے کہ فارغ ہوئے ہیں۔

اور اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ نئے فتح پوری ہدایت اللہ خاں انتقاد کے "بڑے باغ" میں چاروں شانے چت بے ہوش پڑے ہوئے ہیں اور نئے ملیح آبادی خاں "تسگر خورے کو تسکر، اور موذی کو ٹھکر" کی زندہ مثال بنے ہوئے فتح پوری کی زرد رو شہرتِ انتقاد کو ہدایت اللہ خاں کے "کالے پوتے" کی طرح "باغوں باغوں" کی ہوا کھلاتے پھر رہے ہیں۔

جاہلانہ انتقاد — مُردہ باد!

غیظِ ناتوانی — مُردہ باد!

احساسِ کمتری — مُردہ باد!

بُغضِ للّٰہی — مُردہ باد!

"پھس پھس کا کرتب ہے اور لے — مُردہ باد"!

والسّلام

جوشؔ

اس خط میں نیاز صاحب کا بھی کردار واضح ہے اور جوش صاحب کا بھی۔ نیاز صاحب کا اس لیے کہ اُنھوں نے اس خط کو ایک ادبی شاہپارہ سمجھ کر اپنے پرچے میں جگہ دی اور یہ نہ سوچا کہ ہیٹی ہوگی۔ جوش صاحب کا کردار یہ کہ انتہائی غیظ و غضب کے عالم میں بھی براہِ راست حملے کرنے کی بجائے دانستہ تلمیحات کا سہارا لیا۔

اس خط میں جوش صاحب کا کمال اتنا ہے کہ اُنھوں نے اپنی شکایت کو خوبصورت انداز میں پیش کیا مگر نیاز صاحب کا ظرف دیکھئے کہ اُنھوں نے اس "گالی نامہ" کو اپنے پرچے میں جگہ دی۔

نیاز صاحب نے جس بڑائی کا ثبوت ۱۹۵۵ء میں دیا تھا ویسی ہی بڑائی کا ثبوت جوش صاحب نے ۱۹۶۲ء میں آ کر دیا۔ جوش صاحب کی وہ تحریر بھی ملاحظہ فرمالیں جس کا میں نے ابھی ذکر کیا تھا:

> یاد بخیر! یہ ۱۹۲۱ء کی بات ہے کہ میری سب سے پہلی تصنیف "روحِ ادب" شائع ہوئی تھی اور میں اُس زمانے میں آگرے گیا ہُوا تھا جہاں لطیف الدین احمد صاحب کے دانش کدے پر حضرتِ نیاز سے مجھ کو پہلی بار ملاقات کا شرف حاصل ہُوا تھا۔ اس وقت میں بھرپور جوانی کی طرف جا رہا تھا اور نیاز صاحب آغازِ پیری کی طرف مڑنے والے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ نیاز صاحب نے اس ملاقات میں میری اُس زمانے کی تازہ مطبوعہ نظم "جنگل کی شہزادی" کی مجھے دل کھول کر داد دی تھی اور رفرج ادب پر تنقید کا بھی وعدہ کیا تھا جو کبھی ایفا نہ ہو سکا۔

اُس زمانے میں نیاز صاحب ڈاڑھی رکھتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ان کے مُنہ پر ڈاڑھی مجھ کو اچھی نہیں لگی تھی اور یہ بھی یاد ہے کہ اُس زمانے میں نیاز صاحب نے مجھے اپنے قریب آنے کا بھی موقع نہیں دیا تھا۔ نیاز صاحب مجھے اپنے قریب آنے کا موقع کیوں دیتے؟ اس وقت میرے پاس ذہانت کے سوا اور تھا ہی کیا؟

میری جھولی میں تو آج بھی بقدر حوصلہ علم و فکر کی پُونجی نہیں ہے اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس وقت تو مجھ پر علم و فکر کی چھاؤں تک نہیں پڑی ہوگی۔ نیاز کا سا آدمی مجھ کو مُنہ کیوں لگاتا۔

اس کے بعد نیاز صاحب سے حیدرآباد (دکن) میں ملاقات کی مسرت حاصل ہوئی اور میں نے ان کے میزبان ہوش صاحب بلگرامی سمیت اپنے گھر مدعو کیا۔

ہزار افسوس کہ میری وہ مخلصانہ دعوت میرے ایک قرابت دار

دوست کی بے پناہ بدمستی اور شرمناک فحش کلامی کی بنا پر غارت ہو کر رہ گئی۔

وہ میری زندگی کی بڑی منحوس گھڑی تھی کہ اس دعوت میں میرے دوست کی شرافت سے گری ہوئی فحاشی کی بنا پر نیاز اور جوش دونوں کو میری جانب سے بدگمانی پیدا ہو گئی کہ یہ سب کچھ میرے ایما سے ہوا تھا۔

اس بدگمانی کی شکایت نیاز صاحب سے نہیں کی جا سکتی اس لیے کہ جس نامراد قوم کے ہم افراد ہیں وہ اس قدر اوچھی اور گھٹیا ہے کہ اس سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر کمینگی کا ارتکاب کر سکتی ہے۔ چنانچہ اس رات کے بعد ہمارے تعلقات کی دنیا میں سویرا ہو گیا۔ نیاز صاحب مجھ سے بگڑ گئے۔

نیاز صاحب پٹھان آدمی ہیں میں بھی خیر سے پٹھان ہوں اور ظاہر ہے کہ مشتعل ہو جانے کے بعد پٹھان کے امکان سے یہ بات خارج ہو جاتی ہے کہ وہ علتِ اشتعال تک پہنچنے کی زحمت گوارا فرمائے۔

نیاز صاحب کی بدگمانی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس تاریخ سے لے کر پورے ایک سال تک نگار کے ہر پرچے میں وہ مجھ پر تبرا کرتے

رہے اور اس کے بعد ہر چند، ہر پرچے میں تو میرے خلاف لکھنا ترک کر دیا لیکن جب بھی ان کو موقع ملا ہے انھوں نے میرے خلاف لکھنے میں کبھی ایک بار بھی تساہل سے کام نہیں لیا۔

ہر چند اس وقت میں جوان اور سریع الاشتعال نوجوان تھا۔ لیکن نیاز صاحب کے کسی ایک مضمون کا بھی میں نے جواب نہیں دیا۔ البتہ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی خاطر میں نے ان پر ایک بہت ہی سخت نظم کہی۔ لیکن اپنے دوست اعجاز الحق صاحب قدوسی کو سنانے کے بعد اس کو بھی شائع نہیں کیا اور چاک کر کے پھینک دیا مضامین کے علاوہ نیاز صاحب نے اس زمانے میں لوگوں کو میرے خلاف بڑے بڑے طویل خط لکھے۔ جن میں ایک خط تو اس قیامت کا تھا کہ اگر حالات میری مساعدت نہ کرتے تو میں جس نگر میں دھونی رما کر بیٹھا تھا وہیں دفن کر دیا جاتا۔

پھر بھی میں نہایت واضح طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ نیاز صاحب کے اس فرطِ غضب میں ان کی کوئی خطا نہیں تھی۔ کون معاف کر سکتا ہے ایک ایسے فرومایہ شخص کو جو اپنے دوستوں کو خود اپنے گھر بلا کر ذلیل کرتا ہے۔ نیاز صاحب نے مجھ کو ایک ایسا شخص تسلیم کر لیا تھا اور اس لئے انھوں نے میرے باب میں جو کچھ بھی کیا

وہ انسانی فطرت کے عین مطابق تھا۔

اب یہ بھی سُن لیجئے کہ میں نے کیوں جواب نہیں دیا تھا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھ کو اس بات کا سو فی صد یقین تھا کہ اگر میرے کلام میں جان ہے تو دنیا کی کوئی قوت اس کو دبا نہیں سکتی اور اگر جان ہی نہیں ہے تو ایسے بے جان کلام کی حفاظت کرنا میرا تضیع اوقات ہے اور اس کی دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ اُس البیلی جوانی اور اُس البیلی جوانی کے گرجتے برستے اشتغال میں کس کی یہ مجال تھی کہ گھنیری زلفوں کی چھاؤں سے نکل کر جواب نویسی کی دھوپ میں آ کر بیٹھ جاتا۔

اس فصل میں اس درجہ رہا ہے خود و سرشار
میخانے سے باہر مجھے دیکھا نہ کسی نے

اس لیے میرے جواب نہ دینے کو براہ کرم میری شرافت پر محمول نہ فرمایا جائے۔

بُنیاد تھی اس کی نوجوانی پیری

بہرحال اب وہ طوفانی دور باقی نہیں رہا ہے۔ اب ہم دونوں ضارب و مضروب بوڑھے ہو چکے ہیں۔ نا قابلِ برداشت بوڑھے سریع الاشتعال جوانیاں ہم سے ہمیشہ کے واسطے رخصت ہو چکی ہیں

ہمارے سروں کے بال گر چکے ہیں لیکن کھوپڑیوں میں پختہ عقل کا اکھوا پھوٹ آیا ہے۔

اس منزل میں ہمارے واسطے یہ نا زیبا اور شرمناک حد تک نازیبا ہے کہ ہم اپنی پرانی یادوں اور طفلانہ جذبات کی بنا پر امرِ حق پر پردہ ڈالنے کا ارتکاب کریں۔ اس لئے کامل ذہنی سکون اور دیانت کے ساتھ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حضرتِ نیاز چند انگنے گنے استثنائی افراد میں سے ہیں جن کے پیدا کرنے کے معاملے میں یہ دوں پرور آسمان ازل سے کر اب تک بخل کرتا چلا آرہا ہے۔

جب یہ دیکھتا ہوں کہ ان کی ایک ذات کے احاطے میں اتنے خلاقی کے شہر آباد ہیں، اتنے شعور کے لشکر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں اور رامش و رنگ کی اتنی بے شمار براتیں اُتری ہوئی ہیں تو بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ ان کو کلیجے سے لگا لوں۔

کاش نیاز فتحپوری کا سا خالقِ طرزِ انشا پرداز کسی زندہ قوم میں پیدا ہوتا لیکن کیا کیا جائے ؏

ہائے وہ عقل جو زنجے میں ہو دیوانوں کے

یہ مضمون کچھ "موازنۂ جوش و نیاز" قسم کی چیز بنتا جارہا ہے۔ میں نے

اس لغزش سے بچنے کی کوشش تو کی مگر بچ نہ سکا۔ سچ پوچھئے تو بات تو جہ کر اس "زیادتی" کا مرتکب ہوا۔ بہ مجھے بہانے بہانے سے نیاز اور جوش کی شخصیتوں کو مزید واضح کرنے کے لئے ایسا کرنا ہی تھا۔

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ نگار میں جوش صاحب کے خلاف خوب خوب لکھا گیا ـــ ہم سب جانتے ہیں کہ غصے اور ضد کی بنیاد پر جو عمارتیں بنائی جاتی ہیں وہ پانی پر نمک کی دیواروں سے زیادہ زندگی نہیں پا سکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ نیاز صاحب نے جوش صاحب کے خلاف جتنے بھی حصار باندھے وہ ان کی شہرت کے سفینے کے سامنے ٹھہر نہ سکے۔

اللہ کا شکر کہ ۴۰ برس کی تناتنی کے بعد اب کہیں جا کر کھوپڑیوں میں بچہ عقل کا اکھوا پھوٹا ـــ اور یوں دونوں جن گلے ملے۔

جوش صاحب کی ایک کمزوری لغات بھی ہے۔ ذرا ذکر چھیڑ دیجئے تو پھر دیکھیں کہ کیا کچھ ارشاد نہیں ہوتا۔ کیا کچھ رونا نہیں روتے۔ مثلاً:

"بڑا لمبا کام ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آکسفورڈ ڈکشنری کی طرز پر لغت تیار ہوتی۔ پچاس برس میں تو وہ لغت تیار ہوئی تھی۔ پھر اس میں ۲۵۰ اسکالرز نے بلا معاوضہ کام کیا تھا۔

میں چاہتا ہوں۔ ہر لفظ کا صحیح استعمال بتایا جائے۔ مثلاً رونے کی کئی کیفیتیں ہیں جیسے سسکی، سبکی، ہچکی، جب تک ان کی آواز کے فرق کا پتہ

نہ چلے بات نہیں بنتی۔ یہی وجہ ہے کہ میں کہتا ہوں کہ ایک لغت کے ساتھ ایک ٹیپ ریکارڈر مشین بھی ہو جو سسکی ہُسکی اور ہچکی کا فرق بتائے۔

پھر ابھی بے شمار نئے الفاظ کی ضرورت ہے جو ابھی تک بنے ہی نہیں۔ مثلاً اِزار بند ڈالنے والی لکڑی کا کوئی ایک نام نہیں ہے۔ سب یہی کہتے ہیں کہ ازار بند ڈالنے والی لکڑی دینا۔ اس کے لیے میں نے "کمرنی" کا لفظ بنایا ہے یا "اِزار کش" بھی ہو سکتا ہے۔

پھر سونے کے لیے ایک لفظ خواب ہے۔ اس ایک لفظ کی مختلف کیفیتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے ۵۳ لفظ بنائے ہیں۔ مثلاً پڑھتے ہوئے نیند آ جائے تو اس کے لیے میں نے "خوابِ مطالعہ" کا لفظ بنایا ہے۔ ریل میں نیند آ جائے تو اس کے لیے "خوابِ حرکت"۔ مطلب یہ ہے کہ اُردو کو اتنے الفاظ دیئے جائیں کہ اس کی ہر ہر کیفیت کو ظاہر کریں۔

پھر الفاظ میں بھی خاندان اور قبیلے ہوتے ہیں۔ ہمیں الفاظ کا آپس میں میلاپ کرتے ہوئے اس بات کا ضرور خیال رکھنا چاہیئے کہ ان میں سے کوئی لفظ نیچ خاندان کا تو نہیں۔ اگر اس کا خیال نہ رکھا گیا تو خاندانی الفاظ کی نسل تباہ ہو جائے گی۔ پھر یہ بھی ہے کہ بعض الفاظ پردہ کرتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ بڑے پیار کے ساتھ گھونگھٹ اُٹھا دیا جائے۔"

میرے پاس ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر ہے جو بیٹری سے چلتا ہے جوش صاحب ترنگ میں تھے۔ میں نے اسے اون کر دیا اور انھیں پتہ بھی نہ چلا۔ آواز ملاحظہ ہو:

"مسلمانوں نے تجارت شروع کر رکھی ہے۔ نمازیں پڑھو۔ روزے رکھو جنت ملے گی۔ اس تاجرانہ ذہن کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ اچھے کام اس لیے کرنے چاہئیں کہ اس سے اپنا اور دوسروں کا بھلا ہوتا ہے۔ کانوں کی معرفت بڑا زہر پلایا گیا ہے۔ جہاں تک ہو سکے آدمی کو مذہب سے دور رہنا چاہیے اور اگر کوئی مذہب قبول کرنا پڑے تو اسلام قبول کرنا چاہیئے۔ اس لیئے کہ اس میں سب سے کم وہم ہیں۔

مادی اور روحانی بہتوں کے ساتھ ساتھ جب تک ایک ہتیہ نفسیات کا نہ لگے گا۔ اس وقت تک بات کھل کر سامنے نہ آ سکے گی۔ ویسے رسولؐ نے جو "کن فیا کون" کہا تو بڑی بات کہی۔ رسولؐ کی بڑائی سے کوئی بھی انسان منکر نہیں ہو سکتا۔ پھر رسولؐ نے جو باتیں کہیں وہ اس وقت کے لوگوں کے ذہن اور ان کی بساط کے مطابق کہیں مگر وہ باتیں آج بھی اتنی ہی اہم ہیں۔ یہ بڑائی ہوتی ہے ایک پیغمبر کی۔"

کسی نے ٹوکا "جناب قرآن کی باتیں رسول کی باتیں تو نہیں ہیں انھیں آپس میں گڈمڈ نہ کریں۔"

اس پر جوش صاحب نے یہ شعر پڑھا ؎

کھل کر کہوں تو کفر کے فتوے لگائے خلق

وہ ارتقائے نوعِ بشر دیکھتا ہوں میں

اور اس کے ساتھ اپنی بات کی وضاحت یوں فرمائی — "جاہلو! کچھ عرصے کے بعد انسان موت پر بھی قابو پالے گا۔ اس لئے کہ جتنی قوتیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ وہ اگر بحال رکھی جا سکیں تو موت کا وجود نہ رہے گا۔

وہ جو آپ کے ایک دوست پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں۔ ادب پڑھاتے ہیں۔ موٹی موٹی کتابیں لکھتے ہیں۔ وہ مجھے ایک دن کہنے لگے "جوش صاحب! میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں"

میں نے انھیں ڈانٹ دیا کہ آپ کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ سوال کیا جاتا ہے پوچھا نہیں جاتا"

پھر انھوں نے کسی بات پہ کہا "پھر؟"

میں نے کہا "پھر کا جواب پھُر!"

پھر تھوڑی دیر بعد انھوں نے کسی بات پر کہا "کیوں؟"

میں نے کہا "کیوں کا کوئی جواب پیدا نہیں ہوا۔ کیونکر کی نوبت آئی ہے"

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد جوش صاحب نے فرمایا "ایک

علامہ یہ ہیں۔ ایک علامہ وہ تھے یعنی علامہ عبداللہ عمادی! ـــــ جو بات کہی ترازو کا تول، ہر مشکل کا حل موجود! ـــــ ایک دفعہ ہم علامہ کو رنڈی کے کوٹھے پر لے گئے۔

مولانا سے بڑے مودّب بن کر عرض کیا "مولانا! میرے ایک دوست کے ہاں آپ کی بھی دعوت ہے۔ اگر آپ میرے ساتھ تشریف لے جائیں گے تو میری اور میرے دوست کی عزّت افزائی ہوگی۔"

مولانا نے بڑی معصومیّت سے فرمایا "اگر یہ بات ہے تو ضرور چلوں گا۔"

مقرّرہ وقت پر، میں مولانا کو لے کر چلا، رنڈیوں کا بازار آیا تو کہنے لگے۔
"ارے جوش یہ تو رنڈیوں کا بازار معلوم ہوتا ہے۔"

"جی ہاں! مگر میرے دوست ذرا آگے رہتے ہیں۔" اس طرح میں نے انھیں رنڈیوں کے بازار میں سے گزارا، یہ لمبی لمبی سفید نورانی ڈاڑھی، چوڑے پائنچوں کا پاجامہ، چلنے میں بھاگنے کی سی کیفیت دیکھ کر سبھی متوجہ تھے۔
ایک جگہ رُک کر میں نے کہا "مولانا آگیا میرے دوست کا مکان!"
"الحمدللہ!"

میں نے ایک مکان کی سیڑھیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا "چلیے!"
مولانا کو شک تو گزرا کہ یہ مکان بھی اُس علاقے کا حصہ ہے۔ چونکہ

وہ کسی پر بدگمانی کرنی جانتے نہ تھے۔ اس لیئے ذرا تامل کے بعد سیڑھیاں
پڑھنے لگے۔

آگے آگے وہ، پیچھے پیچھے میں، پہلی منزل پر پہنچ کے مولانا نے کھنکھارا
تاکہ صاحب خانہ کو علم ہو جائے کہ کوئی آیا ہے۔ ادھر سے نسوانی آواز
آئی "بے تکلف چلے آیئے"

مولانا آگے بڑھے تو نائکہ نے نورانی شکل دیکھ کر طنزیہ ہنسی کے ساتھ
کہا "تشریف لایئے"

بوکھلاہٹ میں مولانا نے کہا "وہ کہاں ہیں؟"

"آپ پتریا کا پوچھ رہے ہیں؟"

اس پر مولانا لاحول پڑھتے ہوئے نیچے اترے۔ اب میں آگے آگے تھا
اور وہ پیچھے پیچھے۔ راستہ بھر کہتے رہے "میں تم سے سمجھوں گا ۔۔ میں تم سے
سمجھوں گا ۔۔۔ رنڈی کے کوٹھے پر چڑھا دیا ۔۔۔ رنڈی کے کوٹھے پر چڑھا دیا"

اس کے علاوہ جوش صاحب کی اور بھی بہت سی باتیں ٹیپ ریکارڈر
میں موجود ہیں مگر وہ ایسی نہیں کہ انھیں لکھا جا سکے۔ جو کچھ یہاں تحریر میں آگیا ہے
وہی قدرے زیادتی والی بات ہے اس لیئے کہ نشے کی حالت میں ان کی
جتنی باتیں ہوتی ہیں۔ انھیں کوئی سنجیدہ صورت تو نہیں دینی چاہیئے۔

جوش صاحب اپنے دوستوں کی مدد بڑے شوق سے کرنے میں بلکہ

اس سلسلے میں دوست دشمن، اپنے پرائے کی کوئی تمیز نہیں رکھتے۔ یہ شوق اس حد تک ہے کہ ایک اسامی کے لئے متعدد سفارشیں کر گزریں گے۔

متعلقہ صاحب کہیں گے "جوش صاحب! کل آپ نے ایک اور صاحب کی سفارش کی تھی۔ آج اسی شدّ و مد سے اور اُسی جگہ کے لئے ایک اور صاحب کے لئے کہہ رہے ہیں۔ جگہ ایک ہے۔ لہٰذا یہ فرما دیجئے کہ دونوں میں سے کسے قابلِ توجہ سمجھا جائے؟"

اس سلسلے میں میرا بھی ایک تجربہ ہے۔ میں نے جوش صاحب سے کہا کہ لکھنؤ میں فلاں ادارے نے ہماری کتابیں بلا اجازت چھاپ رکھی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ کچھ کیا جائے۔

"ہاں ہاں ضرور کرو۔ میں تمہیں کمشنر کے نام خط لکھے دیتا ہوں۔ آج ہی لکھنؤ چلے جاؤ اور واپسی پہ بتانا کہ کیا ہوا۔ خط ہے :

اخی العزیز!

حامل رقعہ محمد طفیل صاحب مدیر نقوش لاہور کو اگر آپ کی اخلاقی امداد کی ضرورت ہو تو وہ انھیں ضرور میسر ہو گی۔ اسی یقینِ کامل کے ساتھ یہ چند سطریں قلم بند کر رہا ہوں۔

موسم برشگال کی دھوم دھام یہاں کم ہی رہی۔ لیکن اولیائے خرابات نے اپنی دریا دلی سے اس کو ندھبہ

ابرِ باراں کو جیحون و قلزم سے بھی بڑھا دیا ہے۔

آپ کا پرستار

جوش

صہبا گسار، محبوب پاک پروردگار، "مردود دمِ چار یار"

اِس خط کے چھپوانے کی بہ ظاہر کوئی ضرورت نہ تھی۔ خط میں کوئی خاص بات بھی نہیں مگر جہاں جوش صاحب نے دستخط فرمائے اور اس کے ساتھ جو لکھا "محبوب پاک پروردگار"۔۔ "مردود دمِ چار یار" یہ دونوں باتیں قابلِ غور ہیں۔

یہ خط لیتے وقت میں نے جوش صاحب سے عرض کیا تھا۔ اب ایسا نہ کیجئے گا کہ وہ صاحب، جن کے خلاف آپ نے مجھے یہ خط دیا ہے، اگر آپ کے پاس پہنچ جائیں تو انہیں بھی اس نوع کا خط لکھ دیں کہ اس کی مدد کی جائے۔

اس پر ہنسے، مگر بات بنا گئے۔۔ "اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے تو پھر میں متعلقہ صاحب سے کہتا ہوں ــــ ان میں سے جو زیادہ خوبصورت ہو میری سفارش اُس کے لئے ہے"۔

ہندوستان میں، ان کے تعلقات بڑے بڑے لوگوں سے تھے۔ سبھی سے برابری کا ملنا جلنا تھا۔ جواہر لعل نہرو اور ابوالکلام سے دھڑلے مل سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ ایک مرتبہ مولانا آزاد سے ملنے گئے تو وہ جواہر لعل سے باتیں کر رہے تھے۔ اِنھیں انتظار کرنا پڑا۔ چند منٹ انتظار کیا تو ان کی

پنڈت پنت نے وہاں مزید رکنا گوارا نہ کیا۔ کاغذ کے ایک پُرزے پر یہ شعر لکھ کر
واپس آنے لگے ؂

نامناسب ہے خون کھولانا

پھر اور وقت مولانا

مولانا اور پنڈت جی کی گفتگو ختم ہو چکی تھی یا کیا کہ وہ دونوں یہ پُرزہ ملتے
ہی ہنستے ہوئے باہر آ گئے اور جوش صاحب کو اپنے ساتھ کمرے میں لے گئے

اُصول کی خاطر یہ بڑے بڑے آدمیوں کو ڈانٹ دیتے ہیں۔ تکلف
نہیں برتتے۔ ان کی کامیابی کا راز یہی ہے۔ اس کی جھلک ان کے خطوط میں
بھی ملے گی جو اُنھوں نے وعدہ فراموش اور تغافل شعار افسروں اور بڑے وسیوں
کو لکھے۔ مثلاً لکھنو کا ڈپٹی کمشنر کسی سے نہیں ملتا تھا۔ اُنھوں نے اسے
ڈانٹ کے خط لکھا اور یہ بھی لکھا کہ مجھے بھی آپ سے ملنا تھا۔ چونکہ آپ اوروں
سے نہیں ملتے۔ اس لیئے میں آپ سے کیوں ملوں۔ اس بات کا صاحب بہادر
پر اچھا اثر ہوا۔ اس کے بعد اُس نے سب سے ملنا جلنا شروع کیا۔

یہی بڑوں سے ملنا اُنھیں مہنگا بھی پڑا۔ سکندر مرزا سے ان کے تعلقات
تھے۔ چیف کمشنر سے ان کے تعلقات تھے۔ اُنھوں نے اِنھیں سبز باغ
دکھائے کہ پاکستان آ جایئے ہم آپ کے لیئے یہ کریں گے۔ وہ کریں گے جب
یہ اُن کی ترغیب پر پاکستان آ گئے تو یہاں کے اخبارات نے شور مچایا کہ جوش صاحب

جو کچھ کر رہے ہیں غلط کر رہے ہیں اور حاکمانِ وقت بھی جو کچھ سوچ رہے ہیں غلط سوچ رہے ہیں - اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ سکندر مرزا (اُس وقت کے صدرِ پاکستان) کچھ کر سکے اور نہ چیف کمشنر، اور بھگتنا پڑا جوش ملیح آبادی کو، "نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم" والی بات ہوئی - یہ غلطی اُنھوں نے اتنی بڑی کی تھی کہ زندگی بھر بھلا نہ سکیں گے -

غرض یہ ہندوستان کو چھوڑ کر پاکستان کے شہری بن گئے - ان کے اور دوستوں کی طرح مجھے بھی تکلیف ہوئی - میں کراچی گیا تو دانستہ ان سے نہ ملا - جب اُنھیں معلوم ہوا کہ میں کراچی گیا تھا اور انھیں ملے بغیر واپس چلا آیا تو اُنھوں نے مجھے بڑے دُکھ کے ساتھ لکھا :

حضرت !

آپ کراچی تشریف لائے اور میرے وجود کی نفی کر کے مجھ سے ملنے تک نہیں آئے

آپ جب دلی آتے تھے تو ایک خورد کی حیثیت سے میرے پاس ہمیشہ آتے تھے لیکن اب چونکہ میں پاکستانی ہو چکا ہوں اس بنا پر آپ کی نظروں میں اپنی توقیر کھو چکا ہوں -

آپ اپنے ذی قدر پرچے میں ایسے شخص کا کلام شائع فرما کر رسوائی کیوں مول لیں جس سے اسلامی دُنیا مُنہ پھیر

چکی ہے ؎

جاؤ بالیں سے ہٹو بھی، موت کو آنے تو دو
چین سے جینے نہیں دیتے تو مر جانے تو دو

جوشؔ

اس خط سے معلوم ہوا کہ جوش صاحب کے دل میں اپنے ملنے والوں کے لئے اور اپنے دوستوں کے لئے کتنی جگہ ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ پاکستان آ کر کتنے افسردہ خاطر ہوئے۔

ایک بار میرے دل میں، جوش صاحب کی طرف سے کچھ بدگمانی پیدا ہوئی خط لکھ مارا۔ جواب آیا:

بندہ نواز!

آپ کو شاید علم نہیں کہ میری ہستی ایک ایسے شیشے کے مانند ہے جس میں نگاہ آر پار ہو جاتی ہے اس لئے اس امر کا یقین فرمائیے کہ اگر میرے دل میں آپ کی جانب سے ذرہ برابر بھی کدورت ہوتی تو میں اُس کو آپ پر ظاہر کئے بغیر چین سے بیٹھتا ہی نہیں۔

اس منفی رُخ کے بعد آپ کو مثبت رُخ بھی دکھانا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ وحشت کے عوض میں اپنے دل میں آپ کی جانب رغبت و اُنس محسوس کرتا ہوں۔

اب رہی میری کوتاہ قلمی اور "جواب خوری" سو آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں مراسلت کے باب میں ہمیشہ وہ رہا ہوں جس کو "مرفوع القلم" کہا جاتا ہے۔

اپنی اس افتادِ طبع کے دوش بدوش میری ہولناک مصروفیت بھی ایسی جان لیوا ہے کہ میرے سر پر دوستوں کے خط کچے ڈوروں میں لپٹی ہوئی تلواروں کے مانند لٹکے رہتے ہیں لیکن جواب لکھنے کی فرصت ہات نہیں آتی۔

آپ کو کاش معلوم ہوتا کہ اس وقت کس قدر اہم فرائض کا خون کر کے یہ خط آپ کو لکھ رہا ہوں اور وہ بھی محض اس خیال سے کہ میری مزید خاموشی کہیں آپ کو مجھ سے مزید بدظن نہ کر دے۔

ہاں اِن دنوں ایک خاصی طویل نظم "آدمی" کہی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کے پاس بھیج دوں اور ضرور بھیج دوں گا۔ بشرطِ فرصت!

میری تمنا ہے کہ یہ خط آپ کو تندرست، مطمئن اور شاد کام پائے۔

نیاز مند

جوشؔ

اپنے نام، جوش صاحب کے خط چھپوانے کا مجھے کچھ شوق نہیں۔ متعدد خطوں میں سے چند خط اس لیے چھانٹے کہ ان میں جوش صاحب بہ نفسِ نفیس موجود ہیں۔ اس لیئے میں نے انہیں آپ سے چھپانا مناسب نہ جانا۔

جوش صاحب مجلسی اخلاق و آداب میں اونچے نظر آتے ہیں (بشرطیکہ وقت شام کے بعد کا نہ ہو) مثلاً کسی شہر میں جائیں گے تو اپنے دوستوں سے ملنے خود جائیں گے۔ یہ اُمید نہیں رکھتے کہ وہ خود ملنے آئیں۔ اسی فی انی ضابطے کی بنا پہ ایک بار مجھ سے کہا:

"دیکھو بھئی۔ تم جو کل ہمیں اپنے ہاں بُلا رہے ہو تو اُس میں فیض اور صُوفی تبسم کو ضرور بُلانا۔ اس لیئے کہ ہم ان سے خود ملنے نہ جائیں گے۔"

"آخر کیوں؟"

"اس لیئے کہ یہ دونوں حضرات کراچی گئے اور مجھ سے مل کر نہیں آئے تھے۔ اس لیئے ہم ان کے پاس خود نہ جائیں گے مگر ہمارا دل ملنے کو چاہتا ہے۔"

ابھی چند مہینے ہوئے کہ لاہور آئے تھے اور اسی دن یہ اعلان فرما دیا تھا کہ کل واپس چلا جاؤں گا۔ مجھے ان کے آتے ہی چلے جانے کا سُن کر افسوس ہوا۔ میں نے جواباً کہا "کل کی بجائے آج ہی چلے جائیے بلکہ ابھی

چلے جائیے۔"

میرے یہ کہنے پر دو منٹ تک خاموش رہے۔ پھر کہا۔" اچھا کل نہیں جائیں گے۔ ایک دن اور صرف تمہاری خاطر سے رُک جائیں گے۔"

یہ اُس شخص کی باتیں ہیں جس نے بڑے بڑے لاٹ صاحبوں کو جوتی کی نوک پر مار دیا۔

اس سے بھی پہلے کا ایک واقعہ یہ ہے کہ جوش صاحب لاہور آئے تھے۔ قائدِ اعظم کی برسی کے سلسلے میں ایک مشاعرہ ہو رہا تھا۔ بانیانِ مشاعرہ کو پتہ چلا کہ جوش صاحب بھی لاہور آئے ہوئے ہیں تو وہ مشاعرہ میں شرکت کی دعوت لے کر ان کے پاس پہنچے۔ اُنھوں نے ٹکا سا جواب دے دیا ——"میں شرکت سے معذور ہوں۔"

کسی نے کہا۔" قائدِ اعظم کی برسی کے سلسلے میں مشاعرہ ہے۔ انکار نہ کیجئے۔ سو باتیں ہوں گی۔"

" باتیں ہوں گی تو ہوں۔ میں بلا معاوضہ نہ جاؤں گا۔ خود قائدِ اعظم نے مسجد شہید گنج کا مقدمہ لڑا تھا تو مسلمانوں کے لیڈر ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں سے دس ہزار روپیہ معاوضہ طلب کیا تھا۔ میں بھی تو قائدِ اعظم کے نقشِ قدم پر چلنا چاہتا ہوں۔"

بانیانِ مشاعرہ بلا معاوضہ لے جانا چاہتے تھے۔ قائدِ اعظم کا نام لے کر

معاملے کی اُونچ نیچ سمجھاتے تھے مگر یہ طرح ہی نہیں دے رہے تھے مگر اس وقت جوش صاحب کے ایک دیرینہ دوست مولانا ابوالخیر مودودی نے منتظمہ صاحب سے چپکے سے یہ کہہ دیا "آپ وقت مقررہ پر آجایئے گا۔ جوش صاحب مشاعرے میں شرکت کریں گے اور بلا معاوضہ کریں گے۔"

مشاعرے کا وقت قریب آیا تو منتظمہ صاحب آن پہنچے۔ جوش صاحب نے ان کی شکل دیکھتے ہی کہا: "بھئی بڑے مجھے چھپاؤ، مشاعرے والے تو پھر آ گئے۔"

مولانا ابوالخیر نے فرمایا: "چھپنے کی ضرورت نہیں۔ انھیں میں نے بلایا ہے"

"کاہے کو بلایا ہے؟"

"تاکہ آپ کو مشاعرے میں لے جا سکیں۔"

"دوستی کا امتحان نہ لو۔"

"جو کچھ کہیں، اب آپ کو جانا پڑے گا۔"

"ابوالخیر تم نے میرے ساتھ بڑی زیادتی کی۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے جانا پڑے گا۔"

دیکھا آپ نے اس رندِ خراباتی کا یہ رُخ، جو کتنا حسین ہے جس میں دوستوں کے لئے کتنی قابلِ رشک جگہ ہے۔

ساری دُنیا میں یہ مشہور ہے کہ جوش صاحب لالچی ہیں۔ میں نے بھی یہ بات سُن رکھی تھی مگر میرے ساتھ انھیں مخلصانہ تعلقات کا دعویٰ بھی تھا۔

جشنِ نقوش کے سلسلے میں (جو انجمن ادبی رسائل پاکستان نے منایا) سیکرٹری صاحب کے علاوہ میں نے بھی خط لکھا کہ آپ تشریف لائیے گا ضرور! — اور یہ بھی واضح کر دیا کہ انجمن صرف آمد و رفت کا کرایہ پیش کرے گی۔ کوئی معاوضہ پیش نہ کر سکے گی۔

جوش صاحب کا جواب آیا:

عزیزم!

"آپ بار بار کرائے کا کیوں لکھتے ہیں۔ بے شک میں چھوٹا، بہت چھوٹا آدمی ہوں۔ لیکن اتنا بھی نہیں کہ اگر آپ کرائے کی خطیر رقم نہ مرحمت فرمائیں تو میں آپ کی تقریب میں شریک نہ ہوں۔

یہ بھی کہہ دوں کہ لاہور آؤں گا تو آپ ہی کی خاطر، لیکن آپ کا مہمان نہیں ہوں گا۔ دو ایک روز، اپنے پاس سے ہوٹل میں ٹھہروں گا جس سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہوگا اور یہ بھی کھول دوں تو کوئی حرج نہ ہوگا کہ میں آپ سے کرایہ بھی نہیں لوں گا۔ بابا کیا میں کرائے کا ٹٹو ہوں۔"

مخلص

جوشؔ

اس خط کے ملنے پر بھی خیال یہ تھا کہ جھونجھل میں آ کر خط تو لکھ دیا ہے مگر اتنی گرمی میں آنہ پائیں گے۔ جون کا مہینہ، جوش سا نازک مزاج، پھر معاملہ

یافت کا بھی نہ تھا مگر دیکھا کہ تقریب سے ایک دن پہلے جوش صاحب لاہور میں موجود ہیں۔ ٹیلیفون کیا۔ "مردود! مروا دیا نا اتنی گرمی میں۔" میں ان کی آواز سُن کر خوش ہو گیا۔ اُنھوں نے نقوش کی تقریب میں پوری دلجمعی سے دلچسپی لی۔

لاہور سے رخصت ہونے لگے تو میں نے انھیں آمد و رفت کے سلسلے میں روپے دلوائے مگر اُنھوں نے واپس کر دیئے۔ کہا۔ "اس تقریب میں شامل ہونا تو میرے فرائض میں سے تھا۔ روپے پیسے کا کیا سوال!"

ایک اور مشاعرے کے سلسلے میں، ان کے ایک افسر دوست نے جو اتفاق سے ڈپٹی کمشنر ہیں، انھیں اپنے ہاں مدعو کیا۔ یہ پہنچے۔ دیکھا تو ڈپٹی کمشنر صاحب اسٹیشن پر موجود نہیں۔ ان کے نمائندہ موجود ہیں۔ اُنھوں نے پُوچھا۔ "بھئی خود کیوں نہیں آئے؟"

"ایک ضروری کام میں اُلجھ گئے ہیں۔"

"اچھا تو اسٹیشن پہ آنا غیر ضروری تھا۔"

یہ کہتے ہی اپنا سامان پھر گاڑی میں رکھوا دیا اور اس مشاعرے میں شرکت نہ کی جہاں سے ایک ہزار روپیہ اور آمد و رفت کا کرایہ ملتا تھا۔

دیکھا آپ نے جوش صاحب روپے کے معاملے میں کتنے لالچی ہیں!

درختوں کی جڑیں بڑی گہری ہوتی ہیں۔ درخت جتنا اونچا ہوگا۔ اتنی ہی گہری جڑیں ہوں گی۔ اصل درخت تو زمین کے نیچے چھپا ہوتا ہے۔ یہی حال

اشخاص کا ہے جو شخص جیسا نظر آتا ہے وہ وہی کچھ نہیں ہوتا۔ اس کے اندر بہت کچھ چھپا ہوا ہوتا ہے۔ شخصیت سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے اُسے صرف زمین پر چلتے پھرتے دیکھ لینا، شخصیت سے آگاہی کے ذیل میں نہیں آتا۔ شخصیت سے آگاہی صرف اُسی صورت میں ممکن ہے کہ کوئی دبے پاؤں چھپی ہوئی شخصیت میں اُتر جائے۔

۲

جوش صاحب کے بارے میں، آپ نے میرے خیالات جان لئے

اب سوال یہ ہے کہ یہ حضرت میرے قابو میں آئے کہ نہیں۔ اس کے بارے میں میرا کچھ کہنا مناسب نہ ہوگا۔ لکھنا میرا کام تھا۔ فیصلہ کرنا آپ کا کام!

آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ جوش صاحب پر دو نمبر نکل چکے ہیں ایک نمبر "افکار" کا، دوسرا "ساقی" کا!

افکار کا نمبر مدح کے کھلتے میں ڈال دیجئے۔ ساقی کا قدح کے!

کسی کی تعریف ہو رہی ہو تو ہم کیوں جلیں۔ البتہ جب کسی کی

پگڑی اُچھلنے والی ہو تو بھلے آدمیوں کا کام ہے کہ وہ خطرے کو سُونگھیں۔

بھلا آدمی نہ ہونے کے باوجود میں نے سوچا کہ یاروں کو تُھکّم تھکّا سے بچاؤں مگر میری کوششیں کامیاب نہ ہوئیں۔

اس سلسلے میں جو میری خط و کتابت "مدیرِ قدح" سے ہوئی وہ بھی پیش کر رہا ہوں کیونکہ اس سے بھی جوش صاحب کی شخصیت کے کئی گوشے سامنے آتے ہیں۔

ایک مکتوبی مثلث[1]

جوش، شاہد اور طفیل

شاہد احمد دہلوی فرماتے ہیں:

ادبی دُنیا میں بھی بھلے آدمیوں کی کمی نہیں ہے جب میں نے ساقی کے "جوش نمبر" کا مفصل اعلان کیا تو محمد طفیل صاحب (مدیرِ نقوش) کو یہ بات بہت بُری لگی۔ وہ جوش صاحب کے قدردان اور مدّاح ہیں۔ قدردان اور مدّاح وہ میرے بھی ہیں۔ شاید اسی لئے طفیل صاحب

---

[1] یہ خطوط ساقی کے جوش نمبر میں شائع ہو چکے ہیں۔

نے یہ چاہا کہ حسبِ اعلان ساقی کا "جوش نمبر" شائع نہ ہو مگر انھیں
اس خاص نمبر کے پس منظر کا علم نہیں تھا۔ یہی مشورہ مجھے چند اور
بزرگ ادیبوں نے بھی دیا تھا۔ اُن میں سے ایک مولانا سید ابوالخیر
مودودی بھی تھے جو مولانا مودودی، امیرِ جماعت اسلامی کے بڑے
بھائی ہیں اور دارالترجمہ، حیدرآباد دکن میں جوش صاحب کے برسوں
رفیقِ کار رہے ہیں۔ چند مہینے پہلے وہ کراچی تشریف لائے تھے
تو اُنھوں نے میرے گھر آکر مجھ سے ملنے کی تکلیف گوارا فرمائی۔
اُن کے ارشاد پر میں نے عرض کیا کہ آپ نے وہ خاکہ ملاحظہ
فرمایا ہے جو میں نے جوش صاحب کا لکھا ہے؟ فرمایا۔
"ہاں، افکار کے "جوش نمبر" میں پڑھا ہے۔" میں نے پوچھا۔
"آپ نے وہ نہیں پڑھا جو "نقش" اور میری کتاب میں چھپا ہے؟"
فرمایا "نہیں"۔ میں نے کہا "آپ اسے ملاحظہ فرمالیں کیونکہ
اس میں مسودے کے وہ حصے بھی شامل ہیں جنھیں مدیر افکار نے
میری اجازت سے قلمزن کر دیا تھا اور ہاں یہ بتائیے کہ آپ
نے جوش صاحب کا جواب بھی دیکھا؟" فرمایا "نہیں۔ وہ کہاں
چھپا ہے؟" میں نے بتایا کہ "جوش نمبر" کے دوسرے ایڈیشن
میں چھپا ہے۔ میں دونوں مضمون آپ کو دیتا ہوں، انھیں آپ

لے جا کر اطمینان سے پڑھئے۔ اس کے بعد آپ جو بھی فیصلہ کریں گے مجھے منظور ہو گا۔" مولانا نے دونوں مضمون پڑھے اور جب دوبارہ تشریف لائے تو میں نے عرض کیا۔ "فرمایئے کیا حکم ہے ؟" مولانا نے افسردگی سے فرمایا۔ "اب میں آپ سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ آپ کے مضمون میں دو ایک واقعات صحیح نہیں ہیں۔ اُن کی تصحیح اگر جوش صاحب کر دیتے تو کافی تھا۔" مولانا بہت کم گو ہیں۔ جچی تلی مختصر بات کہتے ہیں اتنا کہنے کے بعد انھوں نے موضوع ہی بدل دیا۔ طفیل صاحب نے بھی دونوں مضمون نہیں پڑھے تھے۔ میں نے اُنہیں بھیج دیئے اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ آپ ان دونوں پر ایک مضمون لکھ دیجئے۔ طفیل صاحب نے دل میں کہا ہو گا۔ "یک نہ شُد دو شُد، کہا تھا کہ 'جوش نمبر' مت چھاپو، اور حضرت کہہ رہے ہیں کہ "جوش نمبر" تو چھپے گا ہی۔ آپ بھی اس میں لکھیے"۔ بیچ بچاؤ کرنے والا خواہ مخواہ رگیدن میں آجاتا ہے ؎

مُنصفی ہو تو غضب، نامنصفی ہو تو ستم
اُس لئے میرا فیصلہ موقوف مجھ پر رکھ دیا

طفیل صاحب نے بہت رسیاں تڑائیں مگر بھلے آدمی کی بڑی مُشکل ہے۔ اُنھیں یہ دھمکی دی گئی کہ اگر آپ رفع شر کی خاطر بھی نہیں لکھیں گے

تو "جوش نمبر" کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہ سکتا ہے۔ بہت گھبرائے
کہ اس گتھی کو کیسے سلجھائیں۔ آخر اڈیٹر ہیں اور ادیب ہیں، ایک حل
اس مصیبت کا سمجھ میں آگیا۔ دو ہفتے ہوئے کراچی آئے تھے تو مجھ پہ
اور اُن میں جو خط و کتابت ہوئی تھی اُسے مرتب کر کے بھیجنے کا وعدہ
کر گئے۔

حسنِ اتفاق سے یہ مضمون اس خاص نمبر کا سب سے دلچسپ
مضمون بن گیا ہے۔ وہ کیسے؟ پڑھ کر دیکھ لیجئے۔

شاہد احمد دہلوی

ماہنامہ ساقی کراچی

۴؍ اپریل ۱۹۶۳ء

برادرم! سلام مسنون

یکم اپریل کا خط ملا۔ شکریہ۔

"نقوش" پر ہم فخر کرتے ہیں۔ اس سے ادبی رسائل کا وقار قائم
ہے۔ اگر آپ سے کسی مسئلہ میں ہم اختلاف کرتے ہیں تو وہ بھی اتفاق
کے لئے۔

"جوش نمبر" دو مہینے سے پہلے تو نہیں چھپتا۔ مجھے "مشرقی پاکستان

نمبر" نے مار رکھا ہے۔

اگر آپ "جوش نمبر" کے لئے کچھ لکھیں تو صفحات حاضر ہیں۔ اُن کی موافقت و توصیف میں افکار کا "جوش نمبر" ۸۰۰ صفحے کا شائع ہو چکا ہے۔ ساقی کے "جوش نمبر" میں ان کا دُوسرا رُخ ہی آنا چاہئے۔ ان کی شاعری پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ شخصیت پر کچھ نہیں لکھا گیا۔ آپ لکھ سکتے ہیں اور بے رُو رعایت لکھ سکتے ہیں۔ متوازن ہی سہی۔ خوبیاں بھی اور خرابیاں بھی۔ لکھ ڈالئے ہمت کر کے۔

آپ نے میرا مضمون بھی پڑھا ہوگا اور جوش صاحب کا جواب بھی۔ اس "جواب" کا جواب ساقی کا "جوش نمبر" ہوگا۔ اُن کا جواب شائع ہونے سے پہلے میں نے قدوسی صاحب اور جالبی صاحب کے ذریعہ جوش صاحب کو آگاہ کر دیا تھا۔ اب اُنھیں معاف کر دینے اور بخش دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ع

کلوخ انداز را پاداشِ سنگ است

خاکسار

شاہد احمد

ماہنامہ ساقی کراچی

۲۲ر اپریل ۶۳ء

برادرم! سلام مسنون

کہئے آپ نے کیا فیصلہ کیا؟ سچی سچی باتیں جوش صاحب کے ایک خاکہ میں لکھ دیجئے۔ آپ نے تو انھیں بہت قریب سے دیکھا ہے۔

اخبارات و رسائل سے معلوم ہوا کہ شوکت تھانوی بہت بیمار رہیں۔ میں انھیں بیمار پرسی کا خط لکھنا چاہتا تھا، کہاں لکھوں؟

خاکسار

شاہد احمد

ادارۂ فروغِ اردو

۱ر ایبک روڈ۔ انارکلی۔ لاہور

برادرِ محترم۔ سلام مسنون!

آپ کے خط ملے۔ شکریہ! — شوکت صاحب کو خط میرے پتے سے لکھ دیجئے۔ میں اُن تک پہنچا دوں گا۔ خیال ہے کہ وہ آج یا کل تک ہسپتال سے گھر چلے جائیں گے۔ ڈاکٹر تقریباً

جواب دے چکے ہیں۔ گھر والے اپنی آخری کوشش کر لینا چاہتے ہیں۔ زندگی بھر ہنسنے ہنسانے والا انسان آج دوستوں کو دیکھتے ہی رو دیتا ہے۔

آپ کے ارشاد کی تعمیل میں میں جوش صاحب پر مضمون ضرور لکھ دیتا۔ میں اُنھیں کوئی بیس برس سے پڑھ رہا ہوں مگر میرا خام مطالعہ آپ کے نمبر کے مزاج کے خلاف ہوگا۔ میری نگاہ اچھائیاں اور بُرائیاں دونوں دیکھتی ہے۔ اچھائیوں کا اظہار برملا کرتا ہوں۔ کمزوریوں کے اظہار کے لیے پہلے جواز ڈھونڈھتا ہوں۔ پھر اشارۃً کچھ کہہ کر اپنا دامن چھڑا لیتا ہوں۔ اتنی احتیاط پر بھی دوست کبھی خوش نہ ہوئے۔

آپ کے پرچہ میں جوش صاحب پر کچھ لکھنا اس بات کا ثبوت ہوگا کہ میں بھی آپ کا ہمنوا ہوں۔ حالانکہ ایسی بات نہیں ہے ساقی کے "جوش نمبر" میں میرے مضمون کا بھی اُلٹا مطلب سمجھ میں آئے گا۔ لوگ کہیں گے نیاز مندی کا دم بھرتا رہا مگر مضمون ایسا لکھا کہ بُرائیوں کا اظہار تو برملا کیا مگر خوبیوں کو اشارۃً بیان کیا۔

میرا مطالعہ یہ ہے کہ جوش صاحب میں بُرائیاں کم، اچھائیاں زیادہ ہیں۔ پہلے تو آپ میرے دماغ کی "اصلاح" کریں۔ اس کے

بعد مجھ سے لکھوائیں تاکہ مضمون ناخلف کے زُمرے میں نہ آئے۔

اُمید ہے کہ آپ اچھے ہوں گے۔ والسّلام

آپ کا

محمد طفیل

۲۵۔۴۔۶۳

ساقی۔ کراچی ۵

۲۸۔۴۔۶۳

برادرم۔ سلام مسنون!

۲۵ر اپریل کا عنایت نامہ ملا۔ شکریہ!

شوکت صاحب کی کیفیت معلوم کر کے از حد رنج پہنچا۔ کیسا ہنسنے ہنسانے والا انسان جُدا ہوا جا رہا ہے۔ اگر میرا خط وقت پر پہنچ جائے تو اُنھیں پہنچا دیجئے گا۔

جوش صاحب کی شاعری اور خوبیوں کا تو میں بھی مدّاح ہوں اور رہوں گا۔ میرا مضمون دیکھ لیجئے نگران کی شخصی خرابیوں کو آخر کیوں نہ ظاہر کیا جائے؟ خیر اس اختلافی بحث میں پڑے بغیر آپ کے لئے مناسب یہ ہوگا کہ آپ میرے مضمون اور اُن کے جواب پر محاکمہ لکھ دیں

اسی سلسلے میں آپ جوش صاحب کی خوبیاں بھی گنا دیں۔ آپ کھل کر میرے مضمون پر اعتراض کیجئے اور اُن کی لکھی ہوئی ناگفتہ بہ باتوں پر بھی۔ آپ کے ایسے مضمون پر تو کسی کو اعتراض نہیں ہوگا ؟ آپ میرے بے حد اصرار پر یہ محاکمہ تفصیل سے لکھ دیجئے۔ جوش صاحب کے بارے میں آپ کی رائے محتاجِ اصلاح نہیں ہے۔ آپ بے تکلف (اگر چاہیں تو) ان کا نثری قصیدہ لکھ دیں۔ میں اُسے ضرور چھاپوں گا۔ لوگوں کو اُن کی خوبیوں سے آگاہی تو ہوگی۔ جوش صاحب کی شخصیت پر لکھا ہی کب گیا ہے ؟ محاکمہ لکھنے میں آپ اس الزام سے بھی بری ہو جائیں گے کہ ساقی کے "جوش نمبر" میں آپ نے مضمون لکھ کر میری ہمنوائی کی ہے یا میرا ساتھ دیا ہے۔

اُمید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے ۔

خاکسار ۔ شاہد احمد

ادارۂ فروغ اُردو

۱۱ - ایبک روڈ - انارکلی - لاہور

۳ رمئی ۶۳ء

برادرم ۔ سلام مسنون !

آپ کا ۲۸ اپریل کا لکھا ہوا خط ملا شکر گزار ہوں ۔ آپ

فرماتے ہیں کہ میں آپ کے اور جوشؔ صاحب کے مضمون پر "محاکمہ" لکھ دوں۔ میں آپ کی اس بات پر بڑا خوش ہوا (واللہ بڑا خوش ہوا) اور خود کو آپ سے بھی معتبر قسم کا آدمی سمجھنے لگا مگر اس کے ساتھ ہی ایسے محسوس ہوا کہ جیسے ایک دم سے میری لمبی سی سفید ڈاڑھی نکل آئی ہو۔ مونچھیں اور بھنوئیں سفید ہو گئی ہوں۔ اس لئے کہ یہ کام بزرگوں کا ہے کہ وہ خوردوں کے جھگڑوں میں منصف بنیں۔

اس جھگڑے میں ایک "خورد" تو ہوئے آپ یعنی کہ حضرت شاہد احمد دہلوی اور دوسرے ہوئے جوشؔ صاحب، رندِ خرابات جوشؔ ملیح آبادی! آپ کا شمار کراچی کے بزرگ ادیبوں میں ہوتا ہے، ایسے بزرگ ادیب، جن کے اپنے بیس بچیس "پٹھے" ہوں جو اُستاد سے بھی پہلے میدان میں اُترتے ہوں، جیسے کلو پہلوان سے کشتی لڑنے کے لئے اُس کے پٹھوں سے کشتی لڑنی پڑتی ہے۔

دوسری طرف ہوئے جوشؔ صاحب، مانے ہوئے اُستاد، ان کے بڑے شاعر ہونے میں اگر کسی کو کلام ہے تو وہ خود کوتاہ بیں ہے، بر خود غلط ہے۔ جوشؔ صاحب آج ہی کے بڑے شاعر نہیں، کل بھی انھیں بڑا شاعر مانا جائے گا بلکہ اُن کے انتقال کے بعد،

ایسے علم و فضل والے نظر ہی نہ آئیں گے یا عرصے بعد پیدا ہوں گے
آپ اُنھیں شخصی اعتبار سے لاکھ بُرا جانیں مگر ہمارا اخلاقی
ضابطہ جس تیزی سے انحطاط کی دہلیزیں چھُو رہا ہے۔ اُس میں
جوش صاحب کل کلاں کو فرشتہ سیرت نظر آئیں گے ۔

بہت جی خوش ہُوا اے ہم نشیں کل جوش سے مل کر
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

والا مضمون ہو گا۔

آپ نے جوش صاحب کے بارے میں جو مضمون افکار میں لکھا تھا، وہ تو میں نے پڑھا تھا، اس کے بعد کیا ہُوا؟ جوش صاحب نے کیا لکھا؟ وہ میں نے اپنی عادت کے مطابق نہیں پڑھا۔ عادت کے مطابق اس لیئے کہ جب ایک دوسرے کے خلاف لکھنا لکھانا شروع ہو جاتا ہے تو میں اُسے پڑھتا ہی نہیں کرتا (میں اپنے خلاف لکھی گئی ہر چیز بھی نہیں پڑھتا) کیوں اپنے دل کو میلا کیا جائے؟ کیوں دوسرے کی زیادتی کے بارے میں سوچا جائے؟

میرے پاس وہ "مواد" نہیں جو ایک دوسرے کے خلاف پھیلایا گیا۔ اگر ہوتا تو میں آپ کے ارشاد کے مطابق گھاس کٹائی

کا کام شروع کر دیتا --- ابھی تو یہی کہوں گا۔ مہاراج شانتی! شانتی!!

آپ کا خط شوکت تھانوی صاحب کے پاس لے گیا تھا ڈاکٹروں نے ملنے ملانے کی ممانعت کر رکھی ہے۔ خیال تھا کہ ہوش میں ہوں گے تو آپ کا خط دے دوں گا مگر افسوس کہ آپ کا خط واپس لانا پڑا۔

اُمید ہے کہ آپ اچھے ہوں گے۔

آپ کا
محمد طفیل

ساقی۔ کراچی ۵
۴ رمئی ۶۳ء

برادرم۔ سلام مسنون!

۳ رمئی کا نوازش نامہ ملا۔ شکریہ!

شوکت صاحب کی کیفیت معلوم کر کے اُن کے لئے دُعائے خیر کی۔ اُن سے میرا ۳۳ سال کا تعلق ٹوٹا جا رہا ہے۔

جو شخص بیس سال سے ادب کا کام کر رہا ہو، وہ بزرگانِ ادب میں شامل ہونے سے کیسے انکار کر سکتا ہے؟ اور پھر بزرگی بر عقل

است نہ بسال - آپ یقیناً اس کے مجاز ہیں کہ میرے اور جوش صاحب کے مضامین پر محاکمہ لکھیں - آپ ایڈیٹر بھی ہیں ادیب بھی - خاکہ نگاری کا بھی خاص سلیقہ رکھتے ہیں - جوش صاحب کا خاکہ لکھنے میں مجھ سے جو کوتاہیاں اور زیادتیاں ہوئی ہیں اُن پر ضرور لکھئے - اس کے بعد اُن کا جواب ملاحظہ فرمائیے - اس کی کاپی ایک آدھ روز میں میں آپ کو بھیج دوں گا - اُنھوں نے جواب میں جو کچھ لکھا ہے کیا اُنھیں وہی لکھنا چاہئے تھا؟ اس پر اپنے خیالات کا اظہار کیجئے آپ اپنے مضمون کو محاکمہ نہ کہیں کچھ اور کہہ لیں۔

جوش صاحب کی شرافت، ان کی زندگی کے اچھے پہلوؤں اور اُن کے ایک بڑے شاعر ہونے سے بھلا کس کو انکار ہو سکتا ہے؟ منکر تو میں بھی نہیں ہوں - اُن خوبیوں کا اعتراف میرے مضمون میں موجود ہے۔

مجھے یقین ہے کہ جب آپ ان دونوں پر بے لاگ رائے دیں گے تو گھاس کٹائی نہیں کریں گے بلکہ ادب کی ایک اچھی خدمت انجام دیں گے۔

اُمید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

کیفیت یہ ہے کہ اس وقت گھر میں ایک سادہ لفافہ

بھی موجود نہیں ۔

خاکسار

شاہد احمد

نقوش ۔ لاہور

۱۱ مئی ۶۳ء

برادرِ محترم ۔ سلام مسنون !

آپ کا پانچویں تاریخ کا لکھا ہوا خط ملا۔ شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اگر آپ مجھے جوش صاحب کا جوابی مضمون بھجوائیں گے تو اور نیکی کا کام کریں گے۔

آج آپ کے نائب مدیر "نقوش" تشریف لائے تھے۔ ذکر جب قیامت کا چھڑا تو بات آپ کی جوانی تک پہنچانے کی ضرورت نہ تھی اس لئے معاملہ جوش صاحب تک ہی رہا اور میں چپکے سنتا رہا۔ علامہ نقش نے فرمایا "جوش صاحب بھولے آدمی ہیں شرارت اُن کی سرشت میں داخل نہیں ۔ یہ سب کیا دھرا جوش صاحب کے دوستوں کا ہے۔"

میں نے پوچھا "کیسے؟"

گویا ہوئے ۔۔" شاہد صاحب کے خلاف مضمون زبردستی لکھوایا

گیا ۔ وہ لکھنا نہیں چاہتے تھے، انھیں ورغلایا گیا کہ یہ جوش نمبر ادبی

دستاویز ہے ۔ اگر آپ چپ رہے تو کل کلاں کو لوگوں تک جو

تصویر آپ کی پہنچے گی ۔ وہ بڑی بھدّی ہوگی ۔ بڑی مکروہ ہوگی، چنانچہ

جوش صاحب غلط قسم کے مشیروں کے چکّر میں آگئے اور شاہد صاحب

کے مضمون کا جواب لکھ مارا۔ (اس کے بعد علّامہ نے چشمہ اتار کر میز پہ

رکھ دیا اور سلسلہ کلام جاری رکھا)

"جوش صاحب اور شاہد صاحب کے مشترکہ دوستوں کو جب

اس بات کا علم ہوا تو ان میں سے اعجاز الحق قدوسی اور جمیل جالبی

صاحب جوش صاحب تک پہنچے، ان سے کہا۔ آپ نے شاہد

صاحب کے جواب میں جو مضمون لکھا ہے وہ آپ کو لکھنا نہیں

چاہیئے تھا اور یہ بھی سنا ہے کہ آپ نے کچھ تیز باتیں بھی لکھی ہیں ۔

اس پر جوش صاحب نے کہا کہ وہ مضمون مدیر "افکار" کے

پاس ہے آپ ان کے دفتر چلے جائیں مضمون دیکھ لیں ۔ اگر آپ

کے نزدیک اس میں کوئی قابلِ اعتراض بات ہو تو اسے حذف

کر دیجیے ۔ میری طرف سے اجازت ہے (اس کے بعد علّامہ نقش

نے میز پر رکھی ہوئی عینک اپنی ناک پہ رکھ لی اور میری آنکھوں

میں آنکھیں ڈال کر کہا):

"چنانچہ مخلصین کا وفد مُدیر افکار کے پاس پہنچا مگر مُدیر افکار چُونکہ جوشؔ صاحب کے خاص دوستوں میں سے تھے اس لئے انھوں نے قدوسی صاحب اور رجا آبی صاحب کو بہلایا مگر مضمون نہ دکھایا پھر کچھ دنوں کے بعد وہ مضمون چھپ گیا۔"

ان باتوں سے میں نے اندازہ یہ لگایا کہ اس معاملے میں جوشؔ صاحب کا اتنا قصور نہیں جتنا کہ ان کے دوستوں کا ہے۔ اگر آپ جوش صاحب کی زندگی کو پڑھیں گے تو ایسے نہ نکلیں گے کہ وہ اپنے مخالفوں کے پیچھے قلمی بندوق لے کے نکلے ہوں۔

اگر یہ واقعات سچے ہیں جن کا میں نے اُوپر ذکر کیا ہے تو پھر ضرورت اس امر کی تھی کہ آپ عمر جوشؔ کے مشیروں کا نکالتے نہ کہ جوش صاحب کا۔ جوش صاحب بے ضرر آدمی ہیں۔ بُرے ہیں تو صرف زُبانی، وہ بھی صرف فقرے بازی کی خاطر۔ یا اپنی ذہانت کی نکاسی کی خاطر، ورنہ ان کا دل خوبصورت ہے۔

یہ بات اپنی جگہ رہی کہ جوش صاحب کنوئیں میں چھلانگ لگانے سے پہلے (تماشا دیکھنے والے) دوستوں کے خلوص پر غور کر لیتے۔ مگر جوش صاحب کو کیا پتہ تھا کہ واسطہ شاہد احمد دہلوی سے نہیں، ڈپٹی

نذیر احمد کے پوتے سے ہوگا۔ شاہد احمد دہلوی اچھے آدمی ہیں مگر جو ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے ہیں۔ اصل میں وہ ہیں خطرناک!

مجھے ایسا نظر آرہا ہے کہ شاید میں یہ مضمون نہ لکھ سکوں۔ اسی لئے تو آپ کو خطوں سے بہلا رہا ہوں تاکہ آپ کو میرے خلاف نمبر نکالنے کی ضرورت نہ پڑے اور یاد اللہ بھی باقی رہے۔

دیکھ لیجئے۔ شوکت صاحب چل دیئے۔ میں کئی دن پریشان رہا۔ عید بھی ایسی گزری جیسے وہ پیچھے سے محرم میں آگئی ہو۔ میرے کچھ کرم فرما پٹنہ سے آئے ہوئے تھے، انھوں نے عید کے دن مجھ سے متعدد بار یہ سوال کیا۔ طفیل! کیا بات ہے، آپ آج بڑے خاموش ہیں؟ میں کیا جواب دیتا۔

خدا کرے آپ اچھے ہوں۔ والسلام

آپ کا

محمد طفیل

ساقی۔ کراچی ۵

۱۳ مئی ۶۳ء

برادرم۔ سلام مسنون!

۱۱ مئی کا عنایت نامہ ملا۔ شکریہ!

شمس صاحب نے آپ سے جو واقعات بیان کئے، وہ صحیح ہیں۔

جوش صاحب سے مجھے نہ تو پہلے دشمنی تھی اور نہ اب ہے۔ اُنھوں نے اپنے مضمون میں میرے متعلق اور میرے باپ دادا کے متعلق نہایت بیہودہ باتیں لکھ دی ہیں۔ لہٰذا مجھے اُن کا جواب دینا ہے اور جواب ہے "جوش نمبر" جس کا الٹی میٹم میں نے اُنھیں ان کے مضمون کی اشاعت سے پہلے دے دیا تھا۔ میں نے اُن سے ساقی کا "جوش نمبر" شائع کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ مجھے اپنا وعدہ پُورا کرنا ہے۔

اپنا استخفاف کوئی گوارا نہیں کرتا۔ میں بھی بے غیرت نہیں ہوں کہ اپنی ذلّت گوارا کر لوں۔ اسے اگر آپ چاہیں تو "خطرناکی" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ میں نے آپ کو دونوں مضمون بھیج دیئے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔ میں آپ کو مجبور کروں گا کہ آپ دونوں پر غیر جانبدارانہ رائے لکھ دیں۔

شوکت تھانوی آخر چلے ہی گئے۔
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

خاکسار: شاہد احمد

ساقی - کراچی ۵

۲۷ر مئی ۶۳ء

برادرم - سلام مسنون!

فرمائیے، کیا فیصلہ کیا آپ نے؟

اگر آپ محاکمہ لکھ کر اس قضیہ کو ختم کرنے کی تحریک نہیں کریں گے تو "جوش نمبر" کی اشاعت کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہ سکتا ہے۔

اُمید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

خاکسار

شاہد احمد

نقوش - لاہور

۲۹ر مئی ۶۳ء

برادرم - سلام مسنون!

آپ کا ۲۷ر تاریخ کا خط ملا۔ شکریہ!

مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے پہلے خط کا جواب نہ دے سکا۔ فرصت کے لمحات ڈھونڈھ رہا تھا اور ابھی اسی کوشش میں تھا

کہ آپ کا دوسرا خط آیا بہ صورت الٹی میٹم۔

ان دنوں نقوش کا نیا شمارہ چھپ رہا ہے۔ ہرچند کہ یہ کوئی خاص نمبر نہیں، پھر بھی میرے حواس باختہ کر دینے کے لئے اتنا کچھ بھی بہت ہے، جلد جواب نہ دینے کی وجہ صرف اتنی ہی ہے کہ نقوش کے پیار میں سب کچھ بھولے ہوئے ہوں یوں ایک ہفتہ اور "بارگاہِ محبوب" میں گزرے گا۔

آپ کے ۳۱ مئی والے خط کا مزاج ناساز ہے۔ میرے دماغ کے پرزوں نے کہا۔ شاہد صاحب "گرمی کھا رہے ہیں"۔ اس لئے مٹی برخورداری کا ثبوت دو۔ چپ رہو۔ ساتھ ہی دھڑکا یہ بھی تھا کہ کہیں طویلے کی بلا بندر کے سر نہ آئے۔ یہاں یہ مثال کچھ اچھی نہیں لگتی۔ ذرا اس مفہوم کا کوئی اچھا سا محاورہ تو لکھیئے۔ آپ کو دسیوں یاد ہوں گے۔ دسیوں گھڑ بھی سکتے ہیں۔ اپن کو تو یہ بھی اجازت کوئی نہیں دیتا۔ ورنہ یہاں پنجابی کا ایک ایسا محاورہ لکھتا کہ آپ کا جی خوش ہو جاتا مگر آپ وہ سمجھتے کہاں!

ایک تو آپ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ "معرکہ جوش و شاہد" میں میری خط و کتابت صرف آپ سے ہے۔ جوش صاحب سے اس سلسلے میں دو چار باتیں زبانی ہوئی تھیں، بس ــــ اس لئے

ساری باتیں آپ ہی کو لکھوں گا۔ اگر اس سلسلے میں جوش صاحب سے بھی خط و کتابت رکھتا تو ایک اُدھر کہتا۔ ایک آپ سے کہتا۔ یُوں میرا ذہنی ہاضمہ برقرار رہ سکتا تھا۔ اب تو میں صرف آپ سے جھگڑوں گا۔

اب آپ کہتے ہیں کہ اگر میں نے محاکمہ لکھ کر اس قضیہ کو ختم کرنے کی تحریک نہ کی تو "جوش نمبر" کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہ سکتا ہے، یہ اچھی زبردستی ہے صاحب!

ویسے "رہ سکتا ہے" میں بڑی گنجائش کے پہلو ہیں مگر میری ازلی بُزدلی کی بنا پر آپ جوش صاحب پر اور طعن تشنیع کے تیر کیوں برسائیں گے؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جوش صاحب کو "بچانے" کے لئے مجھے بھی سُولی پہ چڑھنا پڑے گا۔

اچھا! موجودہ شمارہ چھپ لینے دیجئے، دماغ اپنی جگہ پہ آلے پھر ماتھے پہ تیوریاں ڈال کے سوچوں گا۔ اس کے بعد جو ہو سو ہو۔ ویسے میری خدا سے دُعا اب بھی یہی ہے کہ وہ مجھے بزرگوں کو بُرا بھلا کہنے سے بچا لے۔ لیجئے صفحہ ختم ہو گیا۔ میں کیا کروں۔ والسّلام

آپ کا

محمد طفیل

ساقی۔ کراچی ۵

یکم جون ۶۳ء

برادرِ مکرّم۔ سلام مسنون!

آپ کا ۲۹ مئی کا خط ملا۔ شکریہ!

اس عمر میں بھلا میرا دماغ کیا گرمی کھائے گا؟ اور جوش صاحب کا "جواب" دیکھ کر جو خلل پیدا ہو گئی تھی اُسے بھی میں نے آٹھ مہینے کے عرصے میں دُور کر دیا۔ ان کے جواب کا جواب میں نے اب مئی میں لکھا ہے، ورنہ میں غصّہ میں خبر نہیں کیا اول فول بک جاتا۔ آپ سے میں محاکمہ اس لئے لکھوانا چاہتا ہوں کہ:

(۱) آپ خاکہ نگاری کے اُصول جانتے ہیں۔ آپ نے خود "جناب" اور "صاحب" میں بیسیوں خاکے لکھے ہیں۔ اس لئے آپ میرے لکھے ہوئے خاکہ کو صحیح جانچیں گے۔ مثل مشہور ہے کہ:

پیشِ طبیب مرو، پیشِ تجربہ کار برو

(۲) آپ ادیب ہیں۔ اس لئے ادبی لحاظ سے دونوں مضمونوں کو پرکھ سکتے ہیں۔

(۳) آپ ایک اعلیٰ درجے کے ادبی جریدہ کے ایڈیٹر ہیں۔ اُردو کے بہترین اور بدترین لکھنے والوں سے آپ کا سابقہ رہا ہے

اور رہتا ہے۔ دونوں مضمونوں پر آپ کی رائے وقیع ہو گی — اور

(۴) آپ ایک اچھے انسان ہیں۔ جھگڑے فساد سے دُور رہتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی جھگڑے فساد سے دُور رہیں۔ لہٰذا اس جھگڑے کو ختم کرانے کے لئے آپ ہی موزوں شخصیت ہیں۔

دونوں مضمون آپ کے سامنے ہیں۔ ان پر اپنی بے لاگ رائے لکھ دیں۔ نہ مجھے بچایئے نہ جوش صاحب کو۔ جھگڑے فساد کو رفع کرنا تو کارِ خیر ہے اور ایسے کام اچھے لوگ ہی کیا کرتے ہیں۔

لہٰذا فرصت نکال کر محاکمہ لکھ ڈالئے۔

اُمید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

خاکسار

شاہد احمد

نقوش۔ لاہور

برادرم۔ سلام مسنون!

یکم جون کا لکھا ہوا خط ملا۔ شکر گزار ہوں۔

(۱) آپ نے مجھے سو طرح سے سمجھایا کہ میں ہی اس جھگڑے کو ختم کرانے کے لئے موزوں ترین شخص ہوں مگر میرا دل کہتا ہے کہ

اس معاملے میں پڑنے والا اگر کوئی غلط ترین آدمی ہو سکتا ہے تو وہ اس خاکسار کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا۔

(۲) یہ تو فرمائیں کہ جوش نمبر کب تک نکلے گا؟ اور اس برات میں کون کون ہوں گے؟ میرا خیال ہے کہ آپ اس نمبر کو ذرا متوازن قسم کا چھاپیں، جوش صاحب کے صرف بُرے پہلوؤں کو سامنے نہ لائیں بلکہ اچھے پہلو بھی لائیں۔ آپ کہیں گے کہ تعریف و توصیف میں ایک نمبر پہلے نکل چکا ہے۔ میں کیوں نکالوں؟ —— آپ متوازن پرچہ اس لئے چھاپیں کہ کوئی انگلی نہ اٹھے۔

(۳) سارے لاہور میں آپ کی کتاب "گنجینۂ گوہر" نہیں ملتی۔ یہ میرے پاس ہوتی تو میرے لئے رہبر بن جاتی۔ براہ کرم اپنے پبلشر سے کہیں کہ وہ مجھے اس کتاب کا ایک نسخہ وی پی کر دیں۔ ریویو تو اس کتاب پر بہت دیکھے مگر بکنے کے لئے یہاں کسی بک اسٹال پر نہیں آئی۔ یہ طریقہ بھی اچھا ہے کہ حملہ ہو تو پوری تیاری کے ساتھ۔

(۴) کتاب ملنے پر میں اپنے تاثرات لکھ بھیجوں گا مگر وہ اشاعت کے لئے نہ ہوں گے بلکہ آپ کے حکم کی تعمیل میں ہوں گے۔

(۵) اور ہاں کیا "جنگ" کا وہ تراشا مل جائے گا جو جوش صاحب نے اپنے معاشقوں کے بارے میں لکھا تھا؟

محمد طفیل

۶/۶/۶۳

ساقی۔ کراچی ۵

۸ جون ۶۳ء

برادرم۔ سلام مسنون!

۶ جون کا عنایت نامہ ملا۔ شکریہ۔

میں نے کتاب کے چھپتے ہی ایک فہرست بنا کر پبلشر صاحب کو دے دی تھی کہ انھیں کتاب بھیج دی جائے۔ آج معلوم ہوا کہ آپ کی خدمت میں اب تک کتاب ارسال نہیں ہوئی۔ سخت شرمندگی ہے۔ آج خود کتاب لا کر بھیج رہا ہوں۔ لاہور سے چند اور شکایتیں بھی موصول ہو چکی ہیں کہ کتاب نہیں ملتی۔ پبلشر صاحب کو ایسے خط بھیج دیتا ہوں۔ یہ کتاب آپ کی نذر ہے، جی چاہے تو آپ اس کا ریویو لکھ کر نقوش میں شائع کر دیں ورنہ میرے لئے یہی کافی ہے کہ یہ آپ کے مطالعہ میں آجائے۔

"جوش نمبر" جولائی میں شائع ہوگا۔ یہ خاص نمبر بالکل ایک رخہ ہوگا۔ اس میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ سبھی مضامین نظم و نثر شائع ہوں گے۔ انگلیاں اٹھنے کا مجھے خیال ہوتا تو میرے سے ساقی ہی کیوں نکالتا؟ جب اوکھلی میں سر دیا تو دھموکوں کا کیا ڈر؟ آپ سے تو صرف یہ درخواست ہے کہ میرے خاکہ اور جوش صاحب کے جواب پر محاکمہ

لکھ دیں۔

جنگ کا تراشا میں نے اپنے مضمون کے لئے حاصل کرنا چاہا تھا۔ نہیں ملا۔ چونکہ میں نے اتفاقاً اسے پڑھ لیا تھا اس لئے یاد رہ گیا تھا۔

اُمید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے،

خاکسار

شاہد احمد

نقوش۔ لاہور

۱۲ر جون ۶۳ء

برادرم۔ سلام مسنون!

آپ کا ۸ر جون کا لکھا ہوا خط ملا۔ کتاب بھی ملی۔ دوہرا دوہرا شکریہ!

آپ کے ارشاد کے مطابق، آج اس خط میں اس "ناگفتہ بہ" موضوع پر چند باتیں کروں گا جس کے بارے میں آپ لکھتے رہے اور میں ٹالتا رہا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر جوش صاحب کے مضمون کا جواب

دینا ضروری تھا تو آپ بھی اُس کے جواب میں مضمون لکھ لیتے۔ مگر اپنے ساتھ اتنی لمبی چوڑی برات لے کے نہ چلتے۔ یہ جو آپ جوش صاحب کے ایک مضمون کے خلاف پورا نمبر چھاپ رہے ہیں۔ یہ زیادتی کی ذیل میں آئے گا۔

آپ کہتے ہیں ــــ "میں خاکہ نگاری کے اُصول جانتا ہوں۔ اس لئے آپ میرے لکھے ہوئے خاکے کو صحیح جانچیں گے۔"
میری گزارش ہے کہ میں خاکہ نگاری میں بھی بڑے اوٹ پٹانگ نظریات رکھتا ہوں۔ مثال کے طور پہ میں مولوی عبدالحق کو شخصیت نگار نہیں سمجھتا، اُنھوں نے شخصی نوعیت کے جتنے مضمون لکھے وہ اپنی جگہ قابلِ قدر ہیں مگر اُن کا انداز سوانحی ہے۔ رشید احمد صدیقی نے بھی بڑے زور کے شخصی مضمون لکھے۔ وہ مضمون اور اچھے ہوتے بشرطیکہ رشید احمد صدیقی خود اتنے بڑے اور اتنے اچھے انشا پرداز نہ ہوتے۔

شخصیت نگاری میں، میں منٹو کے مضامین "گنجے فرشتے" کو اہمیت دیتا ہوں۔ جمیل الدین عالی کے اکلوتے مضمون کو بھی (جو انھوں نے نواب سائل دہلوی پہ لکھا تھا) خاکہ نگاری میں خوشگوار اضافہ سمجھتا ہوں۔ بھلا ایسے خیالات رکھنے والے کو کوئی کیسے تسلیم کرے گا

کہ میں بھی اس باب میں کچھ جانتا ہوں ۔ اگر کوئی خاکہ نگاری میں
میرے عجیب سے نظریات کو تسلیم کرنے والا ہو تو اس سے یہ
بھی کہوں گا کہ آپ کے مضامین "لذیذ" ہوتے ہیں اور فن
خاکہ نگاری میں بھی اونچا درجہ رکھتے ہیں ۔

اب میں ادھر اُدھر کی باتوں کے ساتھ لذیذ مضامین کی
وضاحت کروں گا ۔

بات یہ ہے کہ شخصیت نگاری ایک ایسا موضوع ہے
جسے میں اُستروں کی مالا کہا کرتا ہوں ۔ اس صنفِ ادب میں لکھنا اپنے
دشمن بنانے کے مترادف ہے ۔ قصیدہ پڑھا جائے تو قاری جوتے
مارتا ہے ۔ ہمت کر کے لکھ دیا جائے تو زیرِ بحث شخصیت ٹھوکتی
ہے ۔ اگر کسی کے مرنے کے بعد کچھ کہا جائے تو سب پکار اُٹھتے
ہیں ۔ ہے ہے مرنے کے بعد بھی نہیں بخشا مردود نے ۔

اگر آپ شخصیت نگاری میں مولوی عبدالحق کی تکنیک برتتے
تو آپ سے کوئی بھی ناراض نہ ہوتا ۔ وہ تکنیک ہے تعریف و توصیف
کی ۔ جس طرح آپ پر یہ الزام ہے کہ آپ کا قلم صرف بُرے پہلوؤں
پر اُٹھتا ہے ، اُسی طرح مرحوم کا فن بھی مجروح ہے کہ وہ صرف
اچھے پہلوؤں پر اُٹھتا تھا ۔ ضرورت تھی کہ شخصیت نگاری کے میدان

میں کوئی مولوی عبدالحق اور شاہد احمد کے درمیان پیدا ہوتا۔

خدا کی ہر مصلحت کسی حکمت سے خالی نہیں ہوتی، اس لئے میں کیا جانوں کہ اللہ میاں نے آپ میں یہ خوبی کیوں پیدا کی کہ ایسے ایسے فقرے لکھنے پر قادر کر دیا جو سیدھے جا کر دل کو پکڑ لیتے ہیں اگر اس پر اکتفا کیا ہوتا تو لوگ یہ سوچ کر خاموش ہو جاتے کہ شاہد صاحب کا مزاج ہی ایسا ہے کہ وہ ضرور زہر اُگلیں گے مگر باتیں اس کے علاوہ بھی کچھ ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ چبھتے ہوئے فقرے لکھنے میں آپ کے پائے کا ادیب اور کوئی نہیں۔ میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ آپ کسی شخصیت پر لکھتے ہوئے اس امر کی شعوری کوشش نہیں کرتے کہ ضرور خلاف ہی لکھنا ہے۔ وہ تو آپ کا ایک قسم کا "قلمی مزاج" ہے جو چٹپٹے فقروں کو قلم کی نوک پر آنے سے نہیں روک سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں آپ کو بہت بڑا فقرے باز سمجھتا ہوں۔ موجودہ دور کا سودا سمجھتا ہوں، مگر یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ دانستہ پگڑیاں اُچھالتے ہیں۔

آپ کوئی چیز لکھیں تو یہ ناممکن ہے کہ قارئین اُسے دلچسپی سے نہ پڑھیں۔ مجھے اوروں کا تو پتہ نہیں، میرا اپنا یہ حال ہے کہ اگر

کسی رسالے میں آپ کا مضمون آتا ہے تو اسے جلد سے جلد پڑھ لینا چاہتا ہوں تا کہ مجھے تھوڑا سا مسکرانے کا، تھوڑا سا افسوس کرنے کا اور تھوڑا سا لطف لینے کا موقعہ مل جائے۔

آپ کے مضامین مجھے مسکرانے پر اس لئے اکساتے ہیں کہ آپ کا شگفتہ انداز بجھی ہوئی طبیعتوں میں خوشیوں کی لہر دوڑا دیتا ہے ــ افسوس اس لئے کرتا ہوں کہ آپ اپنی فقرے بازی اور محاورہ بازی کے ہاتھوں خود بھی بے بس نظر آتے ہیں اور یہ چیز آپ کو وراثت میں ملی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد اپنی اسی اُپج کے ہاتھوں سُبک ہوئے۔ آپ بھی ہر دلعزیز نہ ہوں گے ــ لطف یوں لیتا ہوں کہ آپ جیسی من موہنی اُردو لکھ لینا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔

اس مضمون میں ایسے فقرے ہیں جو جوش صاحب کو بُرے لگنے چاہئیں تھے۔ ایک دو نہیں متعدد فقرے ایسے نکالے جا سکتے ہیں دوسرے کہیں کہیں ایسا بھی معلوم ہوتا ہے جیسے کچھ باتیں آپ نے دانت پیس کے لکھی ہوں۔ میں حوالے دینا نہیں چاہتا صرف اپنا تاثر بیان کرنا چاہتا ہوں۔

اس کے ساتھ آپ نے جوش صاحب کی خوبیوں کی بھی تعریف

کی ہے جس کے بلاشبہ جوش صاحب حق دار ہیں اور اس کے بھی حق دار ہیں کہ آپ اُن کی کمزوریوں کو اس انداز میں نہ لکھتے۔ اچھی باتیں تو سب کے مُنہ سے اچھی لگتی ہیں۔ بُری باتوں کو اچھے انداز میں کہہ دینا ہی تو فن کہلاتا ہے۔

آپ کے دادا جان کے بارے میں جو مضمون فرحت اللہ بیگ نے لکھا تھا وہ اتنا خطرناک ہے کہ اُس سے زیادہ کسی کے خلاف لکھا نہیں جا سکتا، مگر اُس مضمون کا کمال یہ ہے کہ لکھنے والے نے حد درجہ ذہانت کا ثبوت دیا اور اپنے قلم کو فن کی عظمتوں سے ہمکنار کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مضمون مزے لے لے کر پڑھا جا سکتا ہے اور ڈپٹی نذیر احمد کی شخصیت (بُرے پہلوؤں کے باوجود) دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔ اس دلچسپ پہلو کے علاوہ جو بات بھی ذہن میں اُبھرتی ہے وہ دبی دبی سی ہے۔

میرا تاثر آپ کے اس مضمون کے بارے میں یہ ہے کہ "فرحت اللہ بیگ کا قلم" اُلٹے رُخ پر چلنے لگا ہے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ خاکہ نگار کو حقیقت نگاری سے آنکھیں نہیں چُرانا چاہئیں لیکن اُس کے پاس ایسا حکمت آمیز قلم ہونا چاہئے کہ وہ کہے سب کچھ، مگر اس ڈھب سے کہ ہر قدم پر سنبھا سنبھا کے انجان

بنتا چلا جائے۔

حقیقت نگاری کی ایک مثال اور بھی ہے۔ وہ ہے عصمت کا مضمون "دوزخی" اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی کے بارے میں۔ شخصیت نگاری میں اس مضمون کو بھی اونچا درجہ حاصل ہے۔ اس کے باوجود میں یہ کہتا ہوں کہ اگر عصمت یہی مضمون عظیم بیگ کی زندگی میں لکھ دیتی تو وہ عصمت کا گلا گھونٹ دیتے۔

جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔ خاکہ نگاری میں جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے وہی آپ کے ہاں کم ہے (صرف چند مضامین میں) میری مراد توازن سے ہے۔ یہ الگ بات ہوئی کہ اس کمی کے باوجود میں آپ کو اس دور کا بہترین خاکہ نگار مانوں بلکہ رشک کروں کہ کاش ایسا لکھنا مجھے بھی آتا۔

میں آپ کے مضامین کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہوں۔ واقعاتی مضمون، توصیفی مضمون اور فنکارانہ مضمون۔ واقعاتی مضامین کی ذیل میں ڈپٹی نذیر احمد، بشیر الدین احمد آتے ہیں۔ توصیفی مضامین میں جمیل جالبی اور ایم اسلم آتے ہیں۔ باقی مضامین بڑے پائے کے ہیں جنھیں میں فنکارانہ مضمون کہتا ہوں۔ میں میر ناصر علی، بیخود دہلوی اور خواجہ حسن نظامی قسم کے مضامین کو کبھی بھول نہ سکوں گا اور یہاں مضمون

جوش ملیح آبادی بھی بڑے زور کا مضمون ہے بشرطیکہ تھوڑی سی احتیاط کر لی جاتی۔

بہرحال میرے نزدیک یہ کتاب قابلِ ذکر ہی رہے گی۔ آج اگر یہ قابلِ ذکر ہے تو کل فخر کے قابل سمجھی جائے گی۔

آخر میں مجھے آپ سے ایک شکایت بھی کرنا ہے (جیسے اب تک کوئی شکایت نہ کی ہو) وہ یہ کہ میں نے آپ کی کتاب "گنجینۂ گوہر" منگوائی تھی، کتاب اس خیال سے منگوائی تھی کہ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ اس میں آپ نے اپنا خاکہ بھی لکھا ہے۔ میرا اندازہ یہ تھا کہ جس طرح آپ کا قلم حقیقت نگاری کے جرم میں بدنام ہے یا بے رحم ہے وہ اپنے بارے میں بھی اتنا ہی بے رحم ہو گا۔ مگر مجھے وہ مضمون پڑھ کر افسوس ہوا کیونکہ وہ مضمون "در مدحِ خود" کی ذیل میں آتا ہے جو باتیں خود نہ کہہ سکے وہ راجہ مہدی علی خاں نے کہہ دیں اور آپ نے چھاپ کر "در پردہ خود لکھ دیں"۔ ان حالات میں، میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو اپنے قلم کا مزاج بدلنا چاہیئے۔ اس لئے کہ وہ اپنے بارے میں تو توصیفی کلمات ہی لکھ سکتا ہے مگر دوسروں کے بارے میں دیدہ دلیر ہے۔ اگر آپ نے اپنے بارے میں بھی جوش صاحب ہی کی طرح بے رو رعایت لکھ دیا ہوتا تو میں ساری

دُنیا سے کہنا کہ جوش صاحب کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اُس کے لکھنے کا حق شاہد صاحب کو تھا۔ اس لئے کہ جب مصنف خود اپنے آپ کو بھی نہ بخشتا ہو تو اوروں کو کیوں بخشے۔ مگر میں کیا کروں۔ آپ نے تو اس مضمون کو کتاب میں شامل کر کے اپنی لُٹیا خود ہی ڈبو دی (ایسی ہی ایک غلطی میں نے بھی کی تھی جس پر آپ نے بھی مجھے ٹوکا تھا۔ پھر اسی قسم کی غلطی آپ نے بھی کر ڈالی)

اب اگر جوش صاحب یا اُن کے دوست یہ کہتے ہیں کہ شاہد صاحب نے مضمون جان بُوجھ کر جوش صاحب کے خلاف لکھا تھا تو اُنھیں کوئی جواب نہ دیا جا سکے گا۔

بے شک آپ کے مضمون لذیذ ہوتے ہیں۔ فن خاکہ نگاری میں بھی اُونچا درجہ رکھتے ہیں مگر احتیاط کی حدیں پھاند جاتے ہیں۔ اگر یہ کمزوری آپ کے مضامین میں نہ ہوتی تو میں کہتا آج تک کسی نے بھی ایسے خاکے نہیں لکھے۔

لیجئے۔ آپ کی ضد پُوری ہو گئی۔ دو چار روز تک کچھ باتیں جوش صاحب کے مضمون کے بارے میں لکھوں گا۔ ہو سکے تو اب مجھے چھٹی دے دیجئے۔

محمد طفیل

ساقی۔ کراچی ۵

۱۰ر جون ۶۳ء

برادرم۔ سلام مسنون!

میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے ایک طویل خط لکھنے کے لئے وقت نکال لیا۔ اس میں بہت سی باتیں میرے کام کی ہیں۔

اندازہ یہ ہوا کہ آپ محاکمہ لکھنا نہیں چاہتے۔ میری خواہش تو یہی تھی کہ آپ "جوش نمبر" کے لئے محاکمہ لکھ کر اس سلسلے کو ختم کر دینے کی تاکید کرتے۔ آپ کا جی یہ نہیں چاہتا تو خیر، جو مزاجِ یار میں آئے۔

آپ نے شوکت تھانوی نمبر شائع کرنے کا اعلان بھی بھیجا ہے کیا مجھے اس کے لئے لکھنا ہے؟ میری کمزوریاں تو آپ کو معلوم ہی ہیں۔ اگر آپ مجھ سے لکھوائیں گے تو اس میں ناگوار باتیں کچھ زیادہ ہی ہوں گی۔ پطرس پر میں نے اسی لئے نہیں لکھا تھا۔ فرمائیے کیا حکم ہے؟

اُمید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

خاکسار

شاہد احمد

نقوش - لاہور
۱۱- ایبک روڈ- انارکلی -
۲۶ر جون ۶۳ء

برادرِ محترم - سلام مسنون!

آپ کا ۱۹ر جون کا خط ملا - شکریہ!

میں تو یہ چاہوں گا کہ آپ شوکت صاحب پر ضرور لکھیں - آپ کے اسکیچوں کی ساری اچھائیوں اور بُرائیوں کے باوجود یہ چاہتا ہوں کہ آپ کا اسکیچ ملے - جزوی اختلاف کے باوجود آپ سا لکھ لینا کچھ آسان نہیں - باتیں تو سبھی بنا لیتے ہیں خواہ وہ محمد طفیل ہوں یا جوشؔ ملیح آبادی!

اگر آپ میرے پاس ہوتے تو میں آپ کو گلے لگا لیتا - وہ اس بات پر، کہ آپ نے میری برادرانہ درخواست کو قبول فرمایا اور میری "جوش و شاہد" کے باب میں چُپ رہنے والی بات مان لی - شاہد احمد دہلوی زندہ باد!

پچھلی اتوار کو، میں نے الف سے ی تک "گنجینۂ گوہر" پڑھ ڈالی - لُطف آیا، میں اتوار کو کوئی ایسا کام نہیں کرتا، جو لُطف سے خالی ہو -

میں آپ کو ایک اور مضمون لکھنے کی بھی دعوت دیتا ہوں۔ وہ مضمون آپ کو اپنی ذات کے بارے میں لکھنا ہوگا۔ آپ نے جو مضمون لکھا ہے وہ مجھے پسند نہیں۔ اس میں میرا انشا ہدا حمد نہیں۔ وہ تو اللہ والے کوئی اور ہی صاحب ہیں۔

خدا کرے آپ مزے میں ہوں اور اس کا امکان ہے کہ میں جولائی کے پہلے یا دوسرے ہفتے کے درمیان آپ کو بدمزا کرنے کے لئے کراچی آ نکلوں۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے عرس میں "گلڈ" والے بھیجنا چاہتے ہیں تاکہ اس گرمی کی وجہ سے میں کڑاہی میں رہنے کا کام دے سکوں۔ والسلام

آپ کا
محمد طفیل

ساقی۔کراچی ۵
۲۹ رجون ۶۳ء

برادرم۔ سلام مسنون!
آپ کا ۲۶ رجون کا عنایت نامہ ملا۔ تشکریہ!
یہ آپ کی نوازش ہے کہ میری تحریر کو پسند فرماتے ہیں۔ مگر

واقعہ یہ ہے کہ میں لکھنے سے بہت ہی گھبراتا ہوں، اب دیکھئے نا صرف ایک مضمون جوش صاحب پر ایسا لکھا جس میں اچھی بُری باتیں دونوں لکھ دیں تو اس پر کتنا ہنگامہ ہو رہا ہے۔ صہبا لکھنوی صاحب نے جان کھا رکھی ہے کہ ان کے "حفیظ نمبر" کے لئے بھی ایک ایسا ہی مضمون لکھ دوں۔ میں کہہ رہا ہوں میری توبہ میرے باپ کی توبہ، اب کیا مجھے حفیظ سے اور سارے پنجاب سے لڑوانا چاہتے ہو؟ تو وہ کہتے ہیں کہ جوش پر آپ لکھ سکتے تھے، حفیظ پر نہیں لکھ سکتے؟ ہمت ہے تو حفیظ پر بھی لکھئے۔ اب اُن سے اپنی بزدلی کا اقرار کر کے پیچھا چھڑا رہا ہوں۔ گویم مشکل وگرنگویم مشکل۔

تعمیل ارشاد میں شوکت تھانوی پر مضمون لکھنے کی کوشش کروں گا، مگر جولائی کا شاید پورا مہینہ اس میں نکل جائے۔ "جوش نمبر" کا سارا کام سمیٹنا ہے۔ اللہ کے فضل سے ایڈیٹر سے لے کر چپراسی تک میں ہی ہوں۔

آپ بھی نئی سے نئی سوچتے ہیں۔ "آپ بیتی نمبر" ایک عظیم الشان ادبی کارنامہ ہو گا، مگر ہے کسی میں ہمت آپ بیتی لکھنے کی؟ گاندھی جی سچ کے پیچھے لٹھ لئے پھرتے تھے، وہ بھی

بس ٹرخا ہی گئے۔ ایک بات ضرور ہے، آپ کے اس آپ بیتی نمبر سے "بڑے ادیبوں" کی ایمانداری کا امتحان ضرور ہو جائے گا۔

مجھے اللہ توفیق دے کہ ہمت کر کے کچھ لکھ جاؤں۔

میرے پچھلے تین ہفتے نزلہ، زکام، کھانسی میں گزرے اب بھی انجکشنوں کا سلسلہ جاری ہے، افاقہ ہے مگر سینہ ابھی جکڑا ہوا ہے۔ عمر بڑھ رہی ہے اور عناصر میں اعتدال کم ہو رہا ہے۔

کراچی ضرور آئیے۔ ضرور۔

خاکسار

شاہد احمد

نقوش۔ لاہور

یکم جولائی ۶۳ء

برادر محترم۔ سلام مسنون!

آپ کا ۲۹ جون کا خط ابھی ملا۔ شکریہ!

یہ ٹھیک ہے کہ آپ "جوش نمبر" میں مصروف ہیں۔ اب آپ کو اس "عبادت" سے روکے کون؟ مگر بھائی شوکت تھانوی پر مضمون اگر ۱۵۔۲۰ کے لگ بھگ نہ آیا تو بیڑا ہو جائے گا۔ میرا بھی تو

ارادہ یہی ہے کہ یکم اگست تک پرچہ آجائے۔

یہ مولانا صہبا لکھنوی کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ضرور ایسے ہی کام کریں گے جس سے ہنگامہ ہو۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ جن کے بارے میں نمبر نکال رہے ہیں یا نکالیں گے، اُن کے بارے میں خود مخلص نہیں ہیں بلکہ چاہتے یہ ہیں کہ ہر نمبر پہ شور مچے کہ مار دیا، مار دیا۔ جب آپ کی رائے حفیظ صاحب کے بارے میں اچھی نہیں تو پھر نہ اُنھیں مضمون لکھوانا چاہیئے نہ آپ کو لکھنا چاہیئے۔ یہ معاملہ اس صورت میں بھی نازک ہے کہ سوال یوپی اور پنجابی کا اُٹھے گا اور یہ مسئلہ اتنا نازک ہے جسے کسی طرح بھی چھونا نہ چاہیئے جبکہ آپ پر پہلے ہی یہ الزام ہو کہ شاہد صاحب بڑے یو، پی والے ہیں۔

یہ تو آپ نے ٹھیک کہا کہ آپ بیتی نمبر خاصے کی چیز ہوگا۔ یہ بھی آپ نے ٹھیک کہا کہ ادیب سچ سچ لکھتے ہوئے گھبرائیں گے مگر مجھے اتنی اُمید ضرور ہے کہ میر تقی میر کے زمانے کے ادیبوں سے آج کے ادیب زیادہ سچ بولیں گے۔

کراچی آؤں گا۔ گلڈ والے مجھے خواہ مخواہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے عرس میں دھکیل رہے ہیں۔ نہ میں ادیب نہ ادیب کا بھائی۔

پھر قیامت کی گرمی - خود بھی بیمار رہتا ہوں مگر انکار اس لئے
نہیں کیا کہ انفرادی نوعیت کے کاموں میں تو اپنے آرام و آسائش
کے بارے میں سوچ لینا چاہئے مگر اجتماعی نوع کے کاموں
میں خود کو واجد علی شاہ نہیں سمجھنا چاہئے ۔ جب حیدرآباد
تک آؤں گا تو پھر آپ کو آ کر کیوں نہ دیکھوں ؟ وہاں اور بھی
چند ایسے دوست ہیں جو میرے کراچی آنے سے خوش ہوں گے
ویسے ایک خبر یہ بھی ہے کہ کراچی میں میرے صرف مخالف
بستے ہیں مگر میں اس کو نہیں مانتا - میرا کوئی مخالف نہیں
ہے اور کہیں نہیں ہے - سب میرے اپنے ہیں اور میں اُن
سب کا ہوں - ادب کے رشتے سے اگر ہم میں اتنی بھی انسانیت
نہ ہو تو (مجھ سمیت) سب پر لعنت ہو -
خدا کرے آپ بالکل اچھے ہوں -

محمد طفیل

ساقی - کراچی
۳ ر جولائی ۶۳ء

برادرم - سلام مسنون!
یکم جولائی کا خط ملا - شکریہ!

۱۵ - ۲۰ جولائی تک مضمون لکھنا مشکل ہے۔ تاہم کوشش کروں گا۔ اب آپ کراچی آ بیٹھے تو آپ سے بہت سی باتیں ہوں گی۔ میں حفیظ صاحب پر مضمون نہیں لکھوں گاؔ۔ دیکھئے میں یو۔پی والا نہیں ہوں۔ دلّی والا ہوں۔ شاید اسی وجہ سے مجھ میں یو۔پی۔ اور پنجاب کا تعصب نہیں ہے۔

مخالف تو سبھی کے ہوتے ہیں مگر ہمیں اپنے کاموں سے کام رکھنا چاہیئے۔ سب سے بڑی کسوٹی تو خود انسان کا اپنا ضمیر ہوتا ہے، لہٰذا اپنا ضمیر مطمئن ہونا چاہیئے۔

آپ جب کراچی آجائیں تو مجھے ٹیلیفون کریں، یہ اس لئے کہ آپ کا قیام بہت مختصر ہوتا ہے اور اسی میں آپ کو ایک شب میرے ساتھ کھانا کھانا ہوگا۔ کوئی عذر قابلِ سماعت نہیں ہوگا۔ میرا ٹیلیفون نمبر ۴۲۸۵۶ ہے ساقی منفعل کے نام سے ڈائرکٹری میں۔

خدا کا شکر ہے کہ اب میری طبیعت اچھی ہے۔ کھانسی کسی قدر باقی ہے۔ باقی انشاء اللہ زبانی۔

خاکسار

شاہد احمد

ؔ صہبا صاحب نے لکھوا ہی لیا۔

نقوش - لاہور

۵ر جولائی ۶۳ء

برادرم - سلام مسنون!

آپ کا خط ملا۔ میں ابھی اس گاڑی میں سوار ہو جاؤں گا جو کراچی جائے گی۔ مگر میں پروگرام کے مطابق پہلے حیدر آباد اتروں گا۔ ۸-۹ جولائی کو کراچی میں ہوں گا۔ ملاقات بھی ہو گی۔ شکوے شکایتیں بھی ہوں گی۔ کھانا بھی ہو گا۔ سبھی کچھ ہو گا۔ سبھی کچھ کے لفظ سے ڈریئے نہیں۔ ہم دونوں کسی قابل نہیں ہیں۔ میں تو ویسے ہی کبھی کبھی اپنے آپ کو ذہنی دھوکے دے لیا کرتا ہوں۔ بڑا سکون ملتا ہے صاحب!

میں نے سابقہ خط و کتابت کے تحت، جوش صاحب کو بھی ایک خط لکھا تھا، آج ہی اس کا جواب آیا ہے، وہ بھی ساتھ لاؤں گا۔

اس وقت اتنی بھی فرصت نہیں کہ آپ کی خیریت ہی پوچھ لوں۔ والسلام

آپ کا

محمد طفیل

کراچی

برادر محترم!

ابھی ٹیلیفون پر، میں نے جوش صاحب کے جس خط کا ذکر کیا ہے وہ درج کرتا ہوں مگر اس سے پہلے کہ آپ جوش کا خط پڑھیں۔ پہلے میرا خط دیکھ لیں جس کے جواب میں جوش صاحب نے مجھے لکھا۔ ملاحظہ ہو:۔

برادر محترم۔ سلام مسنون!

آپ کو ہندوستان گئے ہوئے دو مہینے سے زائد عرصہ ہو گیا ہے۔ برابر دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں آپ بھی قرۃ العین حیدر نہ بن جائیں۔ آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ قرۃ العین حیدر ہندوستان جا کر وہیں کی شہری بن چکی ہیں مگر اللہ کا شکر ہے کہ آپ واپس آنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ "دنیا مانے یا نہ مانے۔ پاکستان کے لئے فخر کی ایک بات یہ بھی ہے کہ اس کا شہری جوش ملیح آبادی بھی ہے۔

شاہد احمد دہلوی سے میری کوئی دو مہینے سے خط و کتابت چل رہی ہے۔ میں نے انھیں بڑا سمجھایا کہ وہ "جوش نمبر" نہ نکالیں مگر وہ نہ مانے، اس کے ساتھ اُن کا ارشاد یہ بھی رہا کہ میں آپ کے

اور اُن کے مضمون پر محاکمہ لکھوں۔ مگر میں نے اپنے آپ کو اس کا اہل نہ پایا۔ ٹال دیا اور کیا کرتا۔

ویسے آپ مجھے یہ تو بتائیں کہ اس سلسلے میں آپ کا موقف کیا ہے؟

اُمید ہے کہ آپ اچھے ہوں گے اور جلد آئیں گے۔ آپ کو دیکھنے اور باتیں سُننے کو جی چاہتا ہے۔ والسلام

محمد طفیل

۲۰/۶/۶۳

اب جوشؔ صاحب کا جواب ملاحظہ فرمالیں۔

عزیزم!

آپ کے خط کا جواب صرف اس قدر ہی ہو سکتا ہے کہ میں شاہد میاں سے کوئی کینہ نہیں رکھتا اور میرا خیال ہے کہ وہ جو کچھ میرے خلاف ہنگامہ کر رہے ہیں اس میں اُن کا کوئی قصور نہیں بلکہ جبرِ حالات نے یہ صورت پیدا کر دی ہے اور ظاہر ہے کہ مجبور پر غصہ نہیں آتا، ترس آتا ہے۔

شاہد صاحب جو چاہیں کہیں جو چاہیں لکھیں میں کوئی جواب نہیں دینے کا۔ میں تو اُن لوگوں میں سے ہوں جن میں عناد و فساد کی

صلاحیت ہی نہیں ہوتی اور جو اپنے بدترین دشمنوں کو بھی بآسانی معاف کر دیا کرتے ہیں ؎

کفرست در طریقت ما کینہ داشتن
آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

نیازمند
جوش
۱/۷/۶۳

شاہد بھائی! — آخر میں، میں آپ سے پھر یہی کہتا ہوں جو ہوا سو ہوا۔ مٹی ڈالیے اُس پر! آئیے میں آپ کو جوش صاحب سے گلے ملواؤں۔ سینے سے سینہ لگے گا تو کدورتیں دُور ہوں گی۔

جوش صاحب کو بھی اس کا اقرار ہے کہ میں اور میری طرح کے سارے انسان کوتاہیوں اور لغزشوں سے مبرا نہیں، پھر جوش صاحب نے اپنی پارسائی کا دعویٰ کبھی بھی نہیں کیا۔ یہ کوئی ولی یا پیغمبر تھوڑا ہی ہیں جو معصوم ہوں، خطاؤں سے پاک ہوں۔ میری اور آپ ہی طرح کے انسان ہیں جو ہر قدم پر ٹھوکر کھا سکتے ہیں۔ لہٰذا چھوڑیے اس قصے کو۔ ورنہ دو آدمی آپ کو بُرا کہیں گے۔ دس آدمی جوش صاحب کو بُرا جانیں گے فائدہ کچھ نہ ہو گا۔ بلا وجہ تھُڑی تھُڑی ہو گی۔

میں آج نیز گام سے واپس جا رہا ہوں۔ میرا یہ خط کل تک آپ کو مل جائے گا۔ والسلام

محمد طفیل
۱۲/۷/۶۳

اختر صاحب

مذہب — اور — رومان!

انہی دو حقیقتوں میں اختر صاحب گم ہیں۔ آئیے انھیں ڈھونڈھ نکالیں۔

ویسے تو یہ پروفیسر ہیں اور نامور پروفیسر، اور میں ادب کا طالب علم ہوں، اور غیر معروف طالب علم، اس لئے میں ایک ایسی ہستی کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں جسے پڑھنے کے لئے علم کی کئی سیڑھیاں طے کرنی پڑیں — اور پھر جانچنے کے لئے؟ — اس کے لئے تو اس سے بھی زیادہ ڈگریاں چاہئیں شخصی پرکھ کی ڈگریاں! — دانا کہتے ہیں کہ کتابیں نہیں پڑھ سکتے تو انسانی چہرے پڑھو۔ میں کہتا ہوں کہ کتابیں پڑھنے کے باوجود انسانی چہرے

نہیں پڑھے جاتے۔

مجھے اختر صاحب سے "مکتبی یا کالجی" درس لینے کا موقع تو نہیں ملا۔ مگر ذہنی طور پر میں اُنھیں استاد مانتا ہوں۔ امام مانتا ہوں۔ اُستاد علم کے معاملے میں، امام کسی اور معاملے میں!

بات طالب علم اور اُستاد کی چل نکلی ہے۔ اس لیے میں بھی اختر صاحب کو طالب علمی کے زمانے سے پہچاننے کی کوشش کروں گا۔ صرف کوشش جو ناتمام بھی ہو سکتی ہے اور ناکام بھی!

تصور کر لیجیے۔ اس وقت ایک محقق کی رُوح مجھ میں حلول کر گئی ہے اور وہ پورے طنطنے کے ساتھ بول رہی ہے:

ابتدائی تعلیم کا زیادہ حصہ اورین (وطن) اور مونگیر میں طے کیا۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اسکالرشپ ملی۔ سنہ ۱۹۲۶ء سے سنہ ۱۹۲۸ء تک سائنس کالج پٹنہ میں رہے۔ اسکالرشپ ملی۔ سنہ ۱۹۲۸ء سے سنہ ۱۹۳۴ء تک بی اے آنرز انگریزی میں کیا۔ گولڈ میڈل ملا۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں ایم اے اُردو کیا۔ فرسٹ کلاس فرسٹ پاس ہوئے۔ گولڈ میڈل ملا۔ ڈی لٹ سنہ ۱۹۵۷ء میں کیا۔

یہاں حلول شدہ محقق کی رُوح سے معذرت کیے لیتے ہیں تاکہ آپ میری باتیں بھی سن سکیں۔

اگر مندرجہ بالا واقعات میں ایک دو اور واقعات کا اضافہ کر دیا جائے تو ان کی سوانح عمری مکمل ہو جائے گی۔ مثلاً ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۵ء تک اٹکی سینی ٹوریم میں رہے اور درس و تدریس کی ملازمت ۱۹۳۸ء سے کی تو بس، اختر اورینوی کی زندگی کے موٹے موٹے واقعات آگئے اور اگر ان کی کچھ عادات پر بھی روشنی ڈالنی ضروری ہو تو یہ جان لیجئے کہ انھیں وٹامن کھانے کا ہوکا ہے۔ خود بھی کھاتے رہتے ہیں اور وں کو بھی کھلاتے رہتے ہیں۔ مجلس آرا ہیں، مگر کبھی کبھی گوشہ نشینی کو اپنی جان کے بچاؤ کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ موجودہ زندگی سے کبھی تو مطمئن ہوتے ہیں اور کبھی ناآسودہ۔ شاگردوں کو جگر کا ٹکڑا سمجھتے ہیں۔ اس کے باوجود کچھ شاگرد شکوہ سنج ہیں۔ دوسروں پر فقرے چست کرتے رہتے ہیں اور اگر کوئی ان سے مذاق کرے تو بگڑ جاتے ہیں۔ ویسے دوستوں کے درمیان اپنے اوپر پھبتی پر بھی ہنس دیتے ہیں۔ احباب سے یہ خوش ہیں اور احباب ان سے خوش!

کھانے میں، لباس میں، آرائش میں، ان کی پسند کچھ اس قسم کی دریافت ہوتی ہے:

کھانے میں — بھنا ہوا چنا، ہرا چنا، کاجو، بیسنی روٹی، انڈے کا حلوہ، بھنا ہوا مرغ، بھونی کھچڑی، فروٹ پڈنگ، فرنی۔

لباس میں — صاف عام سفید کپڑے، جن میں شیروانی بھی شامل،

سوٹ بھی شامل۔

آرائش میں ـــــ صاف ستھرا کمرہ، جس میں کسی قسم کی آرائش نہ ہو

پھول بہت پسند ہیں۔ ایشیائی بھی، مغربی بھی!

دیکھ لیجئے۔ میں نے چند ہی سطروں میں کتنی معلومات فراہم کر دیں۔ تعلیم کا حال لکھ دیا۔ عادات لکھ دیں، پسندیدہ اور مرغوب چیزوں کے بارے میں لکھ دیا۔ ہو گیا نا مضمون مکمل؟

لیجیے وہی محقق کی روح پھر آن نازل ہوئی۔ کہتی ہے:

"برخوردار طفیل کی معلومات ناقص ہیں۔ یہ دکھ اور بھی سوا معلوم ہوتا ہے جب ہمیں یہ علم ہوتا ہے کہ برخوردار کے اختر صاحب کے گھرانے سے قریبی تعلقات ہیں۔ مثال کے طور پر صرف چند کوتاہیوں کی طرف اشارہ کروں گا۔ اختر صاحب کو ۱۹۱۸ء میں ٹائیفائڈ ہوا تھا، جس میں چالیس دن تک مبتلا رہے۔ پھر ۱۹۲۰ء میں انھیں ناسور ہوا۔ ۱۹۲۲ء میں کالا زار۔ ۱۹۲۵ء میں وجع المفاصل، ۱۹۳۱ء میں پھیپھڑوں کی کمزوری غالباً سل۔ پھر ۱۹۳۴ء میں دوبارہ سل کا اور ۱۹۳۷ء میں دوبارہ وجع المفاصل کا حملہ ہوا۔ مگر ان کے مضمون میں ان باتوں کا کہیں ذکر نہیں اور کہتے ہیں ـــــ مضمون مکمل ہو گیا ـــــ چہ خوب!

میں اس مضمون میں ایسی واقعاتی باتوں کو کم سے کم لانا چاہتا تھا مگر کچھ

روایتی تقاضوں کی خاطر اور "کچھ" دو اور دو چار" قسم کے حضرات کے لیے ، کہیں کہیں اس بدعتِ حسنہ سے بھی کام لینا پڑے گا —— اجازت ہے ؟

ویسے سچی بات تو یہ ہے کہ اختر صاحب جو کچھ ہیں اور جیسے کچھ ہیں ۔ وہ تو مندرجہ بالا سطروں میں آ گئے ہیں ۔ چونکہ ہمیں کچھ اور ، کچھ اور کی عادت پڑی ہوئی ہے ۔ اس لیے میں بھی بال کی کھال اتار دوں گا خواہ سلیقہ ہو یا نہ ہو ۔

بچپن میں انھیں کبڈی اور فٹ بال سے دلچسپی تھی ۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اختر صاحب آج بھی کبڈی اور فٹ بال سے شوق فرماتے ہوتے تاکہ دیکھنے والوں کو لطف آتا ۔ ہم سب بڑے عجیب واقع ہوئے ہیں ۔ جو کام ہمیں اس عمر میں کرنے چاہئیں وہ ہم پہلے کر کے دوستوں کے لئے مسرتوں کے دروازے بند کر دیتے ہیں ۔ دوسرے یہ بچپن میں برابر بیمار رہے ۔ شرارت جو بچوں کا حق ہے اس کے لیے انھیں فرصت ہی نہ ملی ۔ مطلب یہ کہ ان کی زندگی سے بچے لطف اندوز ہوئے نہ بوڑھے ۔

کالج میں پہنچے تو اور لڑکوں کی طرح ہا ہا ہو ہو ان کا بھی روز مرہ تھا ۔ یہ عمر وہ ہوتی ہے جب آدمی اپنے آپ میں نہیں ہوتا ۔ ہر چونکانے والی بات

کی دُھن، مرکزِ نگاہ بننے کی آرزو، ہر شرارت پر طبیعت آمادہ، ہر ذمّہ داری سے آزاد، یہ دور بھی کیا دلچسپ ہوتا ہے جس میں مسرتوں کا واسطہ، ہر بے راہ روی سے وابستہ ہوتا ہے۔

اُنھوں نے بھی مقدو ربھر "کالجیا" بننے کی کوشش کی۔ بن ٹھن کے رہتے تھے۔ لڑکیوں کی طرف سے مطمئن تھے کہ کالج کے ہیرو وہیں ہم تو بس اس خوش فہمی کے بعد سپرنٹنڈنٹ کے خلاف فارسی اور عربی میں نظمیں لکھیں شاہ جہان، مالکولس اور بھیرویں میں اُنھیں گالیاں دیں اس لئے کہ وہ راستے کا روڑا تھے۔

ان کے ایک "یارِ کالج" تھے جو ان کی تصویریں بنایا کرتے تھے اور وہ لڑکوں اور لڑکیوں میں تقسیم کر دی جاتی تھیں جس پر ہنگامے بھی ہوتے تھے تالیاں بھی پٹتی تھیں۔

نوجوان جو تازہ تازہ عشق فرماتے تھے۔ وہ سب کے سب ان کے پاس جا کر رُوداد بیان کیا کرتے تھے۔ ان کی آشیرواد لیا کرتے تھے تسکین پایا کرتے تھے جب صورتِ حال یہ ہو تو بھلا بتائیں یہ خود کیسے خاموش رہتے۔ یہ بھی اپنے معاشقوں کی داستان سُناتے (یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ نوجوان ہر اُس نگاہ کو، جو اُن پر اچانک پڑ گئی ہو، اپنے معاشقے کی ابتدا سمجھ لیتے ہیں۔ لہٰذا معاشقوں کی کمی بھی کیا ہو گی)

اختر صاحب میں جتنے بھی اوصاف تھے وہ سب ایسے تھے جو کالج کے
لڑکوں کو بھاتے ہیں۔ اگر کوئی ان حیالوں میں ہر دلعزیز ہونا ہے یا مرکزیت کا درجہ
حاصل کرتا ہے تو وہ اختر صاحب کا ہی شاگرد ہوتا ہے یا اختر صاحب کسی ایسے
ہی اُستاد کے شاگرد ہوتے ہیں۔ محض قابلیت، محض شرافت تازہ خون کو راس
نہیں آتی۔

جی چاہتا ہے کہ اُن دنوں کا ایک واقعہ تو سُنا ہی دُوں :

جن دنوں ہم میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے وہاں نرسیں سب کی سب اینگلو انڈین
تھیں۔ جوانی لڑکوں پر بھی آتی ہے لڑکیوں پر بھی، من چلے بھی ہوتے ہیں وہ بھی
ہوتی ہیں۔ ماحول خوش نظر ہو، حالات "امید افزا" ہوں اور دور دل میں لڈو پھوٹنے
کا ہو تو ایسے میں کسی ایک فریق کو شرارت کی سُوجھے تو خود سوچ لیجیے کیا کیا لطف
نہ آتا ہوگا۔ میرا خیال ہے اس ضمن میں مجھے کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ سبھی مجھ
سے زیادہ "باعلم" ہوں گے۔

پہلے فریقین میں چھوٹی چھوٹی شرارتیں چلیں۔ کبھی کسی کا پلڑا بھاری رہا کبھی
کسی کا۔ اچانک یکم اپریل کو نرسوں کی طرف سے انگریزی میں ایک نظم آئی۔
جس میں سینئر طلبا کا مذاق اڑایا گیا تھا۔ اختر صاحب کے سپرد اس نظم کا جواب
دینا ہوا۔ ان سے انگریزی میں جواب نہ بن پڑا۔ اردو میں نظم لکھی جو غالباً ان کی
پہلوٹھی کی نظم تھی :

خالِ رُخِ موریسن، حُسنِ رُخِ ڈیوڈسن

حسبِ توقع نظم خوب چلی۔ لڑکوں کی نرسوں سے مڈبھیڑ ہوتی تو وہ ان آفت کے پرکالوں سے کترا کر نکل جاتیں۔ کس میں ہمت تھی جو ترنم میں یہ سنتی —

خالِ رُخِ مور لیس —

جیسے گھر والوں کے کانوں میں بھنک پڑ گئی ہو — برخوردار تو لڑکیوں کے حسن کی تعریفیں بھی کرنے لگے۔ چنانچہ اُنھوں نے ان کی شادی کی سوچی یہ اڑنگا ایسا ہے کہ بڑوں بڑوں کے بل نکل گئے۔ ۱۹۳۴ء میں ان کی شادی کر دی گئی تاکہ برخوردار فرہاد اور وامق کی برادری میں اضافہ نہ کرے۔

باتوں باتوں میں اختر صاحب نے بتایا کہ اُنھیں ایک نہایت متقی بیوی کی تلاش تھی۔ اس کے ساتھ رومانیت کے خواب بھی دیکھتے تھے۔ ان کے نزدیک مذہب میں بھی ایک طرح کی رُومانیت ہے۔

یہ زندگی بھر ہمیشہ دو دھاری تلوار سے کٹتے رہے اور وہ تلوار تھی مذہب کی، رُومان کی۔ اللہ کا شکر ہے کہ انھیں بیوی مذہبی بھی ملیں اور رُومانی بھی، ورنہ ان پروفیسر صاحب کے بھٹکنے کے سو بہانے تھے۔

باتوں باتوں میں ایک مرحلہ ایسا بھی آیا تھا کہ میں نے اختر صاحب سے پوچھا ”کیا آپ خوفناک قسم کا سچ بول سکتے ہیں؟“

”بہ فضلِ خدا!“

اب اس بفضلِ خدا قسم کے جواب کے بعد ہمت تو نہ تھی کہ کسی شرارت

کی گنجائش ہوتی مگر بات منہ سے نکل گئی ۔ "آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ کیوپڈ آپ پر بڑا مہربان تھا ۔ کیا یہ سچ ہے ؟"

اُستاد تو یہ ہیں ہی فوراً پینترا بدل گئے ۔۔۔ ہاں میں نے بعض مذہبی شخصیتوں سے محبت کی ہے لیکن اللہ میاں سے اب تک محبت نہیں ہوئی ۔ حضرت محمد صلعم کو بہت چاہتا ہوں ۔ ملک کے قائدین میں پنڈت نہرو اور محمد علی جناح کو بہت چاہا ۔ دوستوں میں رضا نقوی ، شرف عظیم آبادی ، علی اظہر ، زبیدہ ، اے تمنائی ، علی عباس اور محسن سے محبت کی ہے ۔

دیکھ لیا آپ نے صاف غچہ دے گئے ۔ پوچھا کچھ ، جواب کچھ ۔ یہی وجہ تھی کہ کہنا پڑا ۔۔۔ "پیر و مرشد ! آج تو میں آپ کا قائل ہو گیا ۔"

اُنھوں نے میرا منشا تو پہلے ہی مرحلے پر بھانپ لیا تھا ۔ محض تجاہل عارفانہ سے کام لے رہے تھے ۔ اس لئے انھیں میری قائل ہونے والی بات کے جواب میں کہنا پڑا ۔۔۔ اچھا تو سنو ! :

تمہارے اصرار پر ایک معصوم سی یاد اُبھر آئی ہے ۔ گیارہ سال کی عمر میں نگروٹا محل میں احمد شمسی صاحب (ماموں جان) کے یہاں قیام تھا ۔ ان کے فلیٹ کے نیچے ایک بنگالن ۱۳ ۔ ۱۴ سال کی رہتی تھی ۔ تین مہینے تک اس کو بے حد چاہا ۔ کبھی ملے نہ تھے ۔ صرف گیت سنتے تھے ۔ جب شملہ سے واپس ہوئے تو ٹرین میں اس کے فراق میں روتے رہے ۔۔۔ اس کے بعد شکیلہ کو چاہا ۔

اور چاہا گیا۔

بعد ازاں ناگفتنی[1] ـــ میرے لیے نہیں، دوسروں کے لئے ـــ اکثر محبوب بنتے رہے اور محبت کا جواب محبت کی زبان میں دیتے رہے۔

میں نے ان باتوں سے محسوس کیا کہ اختر صاحب مرنے کے آدمی ہیں۔ چھوٹی بڑائی کے قائل نہیں۔ اپنی خامیوں پر بھی نظر ہے اپنی خوبیوں سے بھی آگاہ ہیں۔

دیکھ لیجئے ایک دور وہ ہوتا ہے جب انسان اپنے جھوٹے معاشقوں کا حال بیان کرتا ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ سچی باتوں پر بھی زبان نہیں کھلتی۔

ویسے اتنا ضرور ہے کہ یہ بات بات پر تڑپ سکتے ہیں۔ بات بات پر اٹک سکتے ہیں۔ ذرا تڑپنے اور اٹکنے والی بات کی وضاحت کروں تاکہ معاملہ قابو میں رہے۔

تڑپنے والی بات تو یہ ہے کہ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے دنیا میں کہیں کوئی ظلم ہوا ہو درد کی ٹیسیں ان کے جگر میں اٹھیں گی۔ اٹکنے

---

[1] اس ناگفتنی کا بھی کچھ حال مجھے معلوم ہے مگر جو باتیں یہ خود چھپانا چاہتے ہیں ان کے لکھنے میں لطف بھی کیا!

والی بات یہ ہے کہ بس ذرا جواہر لعل کی طرح اچکن میں پھول اٹکا لینے کے عادی ہیں۔ اس کے علاوہ ریکارڈ بہت اچھا ہے۔

لیجیے! بچپن کے دن اور جوانی کی راتوں کے قصے ختم ہوئے۔

ساری دنیا اختر اورینوی کے رشتے سے شکیلہ اختر کو جانتی ہے مگر میں نے اختر صاحب کو شکیلہ کے رشتے سے پہچانا۔

ادبی حلقوں میں اختر صاحب کی دھاک ربع صدی سے ہے۔ میں بھی ان کے نام سے واقف تھا۔ خط و کتابت بھی تھی۔ مگر جب ۱۹۶۰ء میں شکیلہ بہن ملیں تو اختر صاحب سے باقاعدہ ملاقات ہوئی۔ یہ اعجاز بہن کا تھا کہ اُنھوں نے باتوں ہی باتوں میں اختر صاحب کی تصویر اتار کر دکھا دی۔

۱۹۶۱ء میں میرا دلی جانا ہوا تو شکیلہ کے لکھے پر پٹنہ بھی جانا پڑا۔ ابھی میں پٹنہ سے ایک دو اسٹیشن ادھر ہی تھا کہ آرہ کے اسٹیشن پر ایک صاحبہ ملیں۔

"بھائی صاحب السلام علیکم!"

"جی۔"

"میں شکیلہ کی بہن عذرا ہوں۔"

"اچھا اچھا!"

"مجھے شکیلہ نے لکھا تھا کہ بھائی آ رہے ہیں۔ اس لیے تم انہیں اسٹیشن پر ضرور ملنا۔"

"آپ نے کیسے پہچان لیا کہ میں ہی طفیل ہوں؟"

"واہ بھائی کو پہچاننا بھی کوئی مشکل بات ہوتی ہے۔"

لیجیے صاحب ابھی پٹنہ آیا نہ تھا کہ شکیلہ کے خلوص کا جادو چلنے لگا

پٹنہ آیا تو گھر کے بہت سے افراد کے ساتھ اختر صاحب کو بھی دیکھا۔

شکیلہ نے کہا "آپ بہت خوش قسمت ہیں کہ آپ کے استقبال کے لیے اختر صاحب بھی آئے ہیں۔ ورنہ یہ تو کسی کے لیے نہیں آتے۔" پہلے ہی مرحلے پر، اختر صاحب کی عنایت اور قربت کا احساس دلا دیا گیا۔ ملے بھی بڑے پیار سے، میں نے دیکھا — لمبے قد کے خوبصورت آدمی، جو قطعاً ادیب نہیں لگتے تھے بلکہ کوئی آئی۔ سی۔ ایس افسر معلوم ہوتے تھے۔ یونانی کٹ چہرہ، دودھ جیسی رنگت، جو بہاریوں میں کم لوگوں کو نصیب ہے (ویسے عورتوں کی بات دوسری ہے) کلین شیو، لب ولہجہ دلآویز، آواز میں کھنک، زبان فرفر!

یہ سارے رنگ ڈھنگ ایسے تھے جو حدِ ادب کی تلقین کر رہے تھے مگر میں بھی ایسا کھرا انسان ہوں کہ کسی سے بھی مرعوب نہیں ہوتا خواہ زبان سے کچھ کہوں۔ دماغ یہی کہتا ہے۔ ہُنھ!

اب میرے سامنے اختر صاحب ہیں اور میں ہوں — اختر صاحب کا کمرہ کوٹھی کے ایک کونے میں ہے۔ گھر سے متعلق بھی، گھر سے الگ بھی، مطلب یہ کہ جیسا ماحول بنانا مقصود ہو۔ ویسا بنا لیا جائے۔

یہ جو ادیب لوگ ہوتے ہیں بڑے دلچسپ ہوتے ہیں۔ یہ من کی دنیا میں اتنے محو ہوتے ہیں کہ انھیں گھر سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی۔ بیوی، بچوں کو بھی یہ ایسے ہی سمجھتے ہیں جیسے گھر کی کوئی دوسری چیز مثلاً میز، کرسی، بہت ہوا تو بیوی کو صوفہ سیٹ سمجھ لیا۔

اختر صاحب بیوی کو صوفہ سیٹ سمجھتے ہیں یا کرسی، میں کیا جانوں؟ خیریت ہے تو یہ کہ شکیلہ بھی مشہور افسانہ نگار ہیں۔ اب ان دونوں کے ایک دوسرے کے بارے میں کیا تاثرات ہوں گے اللہ ہی جانے، ہو سکتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو صوفہ سیٹ سمجھتے ہوں۔

ان سے باتیں شروع ہوئیں، ادب پر، سیاست پر، مذہب پر، ہر موضوع پر سمندر کی سی روانی کی طرح بہے۔ یہ بولتے گئے، میں سنتا گیا، تقریر کا سلیقہ، لہجہ میں تازگی۔ میں نے بڑے بڑے مقرر دیکھے ہیں۔ یا تو دل سے موم کر لینے والے۔ مگر ان میں بھی یہ مجھے کم نظر آئے — اُدھر اُدھر کر ذہن ابوالکلام، ظفر علی خاں، بہادر یار جنگ اور عطاء اللہ شاہ بخاری کی طرف نکل جاتا ہے۔

اختر صاحب کی منفردانہ خوبیوں کے ساتھ، جی چاہتا ہے کہ اپنی بھی ایک خوبی کی — اطلاع بہم پہنچا دوں۔ میری اس خوبی کی تشہیر میں اُن کی شرارت آمیز باتوں کا بھی تو حال کھلے گا۔

جن دنوں میں اختر صاحب کے "نرغے" میں تھا۔ اُن دنوں پہلے تو مجھے اپنے کالج لے گئے اور اپنے شاگردوں سے جا کر کہا — "دیکھ لو بھئی یہ ہیں وہ چیز، جس کے دیکھنے کی آپ کو بھی تمنا تھی۔"

اختر صاحب کے ان ریمارکس پر طالب علم مُسکرائے۔ لڑکیاں ہنسیں۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ اختر صاحب میرا آنگٹ لگانے والے ہیں تو میں کبھی ان کے ساتھ نہ جاتا۔ اُنھوں نے تو اتنا کہا تھا۔ ذرا کالج تک چلو۔ میں سمجھا گھمانے پھرانے لے جا رہے ہیں۔ مگر انھوں نے کلاس میں لے جا کر کھڑا کر دیا — "یہ ہیں وہ!"

ستم پر ستم یہ کہ اُسی دن چار بجے شام کہا۔ "چلو چلیں۔"

"کہاں ؟"

"انجمن تماشائے ادب" نے آپ کے اعزاز میں دعوت کی ہے۔"

"نہیں جناب میں نہیں جاتا۔"

"صرف چائے کی دعوت ہے۔ وہاں کوئی مقالہ وغیرہ نہیں پڑھنا ہوگا بفرضِ محال اگر کوئی سوال پوچھ لے تو جواب دے دینا۔"

"اس دعوت کو گول کیجیے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے بھی وعدہ کیا ہوا ہے اور شکیلہ نے بھی وعدہ کیا ہوا ہے۔"

جی چاہا کہ ابھی اپنا سوٹ کیس اُٹھاؤں اور واپس چل دوں۔ اس لیے کہ میں ہنگاموں سے گھبراتا ہوں۔ وہ اور لوگ ہوتے ہیں جو "زبانی" ہوتے ہیں۔

ناچار ساتھ ہو لیا مگر اس عرصے میں کہ یہ کپڑے وپڑے بدلتے میں نے دو چار سطریں لکھنے کی کوشش کی کہ اگر سر پر پڑ ہی گئی تو کچھ کہہ بھی سکوں۔

قلم لے کے بیٹھا تو سب سے پہلے رشید احمد صدیقی کا وہ فقرہ یاد آیا جو انھوں نے ایک جلسے میں کہا تھا ــــ "گھر سے جو کچھ یاد کر کے آیا تھا۔ وہ یہاں آ کر بھول گیا ہوں۔"

اس کے بعد جو کچھ لکھا وہ دیگر یادداشتوں کے ساتھ محفوظ رہا۔ اُسے نقل کیے دیتا ہوں:

دوستو!

قبلہ اختر اورینوی صاحب، جن کے بارے میں آپ کا خیال ہوگا، کہ نہایت معقول آدمی ہیں، اُنھوں نے میرے ساتھ کسی قسم کی معقولیت کا ثبوت نہیں دیا۔ اُنھوں نے ابھی ابھی مجھے یہ خبر سُنا کر بولا دیا کہ تمھیں تماشائے ادب کے جلسے میں جانا ہے۔ میں نے ہاتھ جوڑے اور کہا۔ خدا کے لیے

مجھے نہ لے جائیں۔ اس لیے کہ میں بہو بیٹیوں کی طرح پلا ہوں۔ دُوسرے میری زندگی کا غذ اور قلم کی معیت میں گزُری ہے۔ لہٰذا مجھ سے دہا بگو نہ بنا جائے گا۔ مگر یہ نہیں مانتے اور یُوں میرے جذبات کو گھسیٹ کے یہاں لے آئے ہیں۔

بات یہ ہے کہ لکھنا پڑھنا اور چیز ہے اور اپنی چرب بیانی کے ذریعے دُوسروں کے دلوں کو مسخّر کرنا اور چیز، میں نہ پڑھا لکھا نہ لسان۔ میری تو دوہری شامت آئی ہے۔ مرنا بھی تھا تو یہ کیا ضروری تھا کہ گنگا کے کنارے آکر مرتا۔ ویسے تو گنگا کے کنارے آکر مرنا اچھا شگون ہے۔ بشرطیکہ میں رامچندر کی اولاد میں سے ہوتا۔

میں نے اختر صاحب سے پُوچھا کہ بھائی جان! ذرا یہ تو بتا دیجیے کہ انجمن تماشائے ادب میں تماشے کے علاوہ کیا ہو گا تو اُنھوں نے فرمایا تھا وہ لوگ آپ سے سوال پُوچھیں گے۔ جواب دے دینا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ کسی کو بھی جواب دینا، شُرفا کے نزدیک، کبھی بھی مستحسن نہیں رہا۔ اس لیے مَیں شرفا میں سے نہ ہوتے ہوئے بھی کسی کو جواب دینا پسند نہیں کرتا۔

ویسے مجھے اختر صاحب نے یہ بھی بتایا تھا کہ مجھے وہاں "پاکستان میں اُردو کے مستقبل" پر بات چیت کرنی ہو گی۔ بہ ظاہر یہ سوال معصوم سا معلوم

ہوتا ہے مگر اس کا جواب عرض کرنا آسان نہیں۔ اس لیے کہ ہم پاکستانیوں نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ اُردو کے لیے بھی سوچنا چاہیئے۔ یُوں لگتا ہے کہ جیسے اُردو کی پوزیشن کچھ ایسی ہو گئی ہو کہ جیسے کوئی کنواری لڑکی اپنے ماں باپ کے گھر سے بھاگ گئی ہو۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اُردو کو نہ ہندوستان والے قبول کرتے ہیں اور نہ پاکستان والے۔ یُوں تو ہماری سرکاری زبان اُردو بھی ہے مگر ہمیں جاتے ہوئے انگریز کی دلربا ادائیں نہیں بھُولیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی مغرب سے پاکستان اس لیے آتا ہے کہ اُردو سیکھ آؤں تو وہ انگریزی سیکھ کر واپس جاتا ہے۔ غرض اُردو گھر سے بھاگی ہُوئی لڑکی سہی، مگر ابھی پاکستان میں ایسے اللہ والے ہیں جو اسے اپنی ہی ماں بہن سمجھتے ہیں۔

مجھے زیادہ وقت نہیں ملا کہ میں اس مرحلے سے نپٹنے کے لیے تیار ہو کر آسکتا۔ یہ سراسر اختر صاحب کی شرارت اور آپ کی محبت ہے جو میں یہاں موجُود ہوں۔ بھلا وہ بھی کیا آدمی ہُوا جو وہیں اور کہیں نہ بول سکتا ہو۔

پہلے میرا ارادہ نہ تھا کہ اختر صاحب پر مضمون لکھوں گا مگر ان کی چند ایک شرارتیں یاد آئیں تو سوچا —— یہی وقت ہے انتقام لینے کا۔

ویسے کہیں میں نے یہ بھی پڑھا ہُوا ہے کہ جو شخص دوسروں کے عیوب کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ وہ اس جد و جہد میں دوسروں کے اتنے عیبوں کا

کھوج نہیں پاتا جتنے کہ خود اپنے عیب عُریاں کر دیتا ہے ۔۔ اس کا مطلب تو یہ ہُوا کہ میں اپنے ہی عیوب پر سے پردے سرکا رہا ہوں۔ ایک لحاظ سے یہ بات ہے بھی ٹھیک، اس لیے کہ اختر صاحب میرے لیے غیر نہیں۔ وہ رُسوا ہوئے تو میں رُسوا ہُوا۔

مجبوراً میں پھر اُن کے ابتدائی دنوں کی طرف لوٹتا ہوں۔ وہی محققانہ تقاضے پورے کرنے کے لیے!

ممکن ہے آپ کو یہ کُرید ہو کہ میں ان کا سنِ پیدائش بتاؤں گا۔ یہ بھی بتاؤں گا کہ وہ کہاں پیدا ہوئے۔ یہ سب کچھ بتانا میرا کام نہ تھا۔ ویسے اگر میں یہ بتا دوں تو کچھ حرج بھی نہیں۔ ہاں تو سُن لیجئے کہ یہ ۱۴ اگست ۱۹۱۰ء میں بمقام کاکو ضلع گیا پیدا ہوئے جو ان کا ننہال ہے۔

میرا خیال ہے کہ یہاں دو چار اور بھی کڑوے گھونٹ پی لیے جائیں جو ہم شخص کی پہچان کے ساتھ کچھ تاریخ جغرافیے کے اسباق بھی پڑھ لیں گے۔ مثلاً یہ کہ کن کن اُستادوں سے متاثر ہوئے، کن کتابوں سے متاثر ہوئے۔ کن لوگوں سے متاثر ہوئے۔ کن واقعات سے متاثر ہوئے وغیرہ وغیرہ۔

یہ باتیں بظاہر تھکا دینے والی ہیں۔ دلکشی بھی ان میں کچھ نہیں مگر اختر صاحب کے بارے میں جاننے والے ممکن ہے یہی کچھ سُننا چاہتے ہوں اور وہ باتیں جو میرے نزدیک اہم ہیں سُننا ہی نہ چاہتے ہوں۔ اس لیے احتیاطاً چار و ناچار

وار کئے لیتا ہوں۔

اُنھوں نے ابتدائی تعلیم تو اپنی والدہ سے پائی۔ اردو فارسی، انگریزی اور قرآن حکیم اپنے والد سیّد وزارت حسین صاحب سے پڑھا۔ قرآن شریف با ترجمہ اور تفسیر اور دوسری مذہبی کتابیں اپنے چچا سیّد ارادت حسین صاحب اور حکیم خلیل احمد صاحب سے پڑھیں۔

ان کے علاوہ کچھ اور اُستادوں کے نام بھی بتائے تھے، چند ایک نام لکھتا ہوں۔ مثلاً زیلی سادھو خاں، چارلس ریڈ، چودھری حیدر علی خاں پروفیسر جے۔ ایل۔ بی، فضل الرحمٰن اور ڈاکٹر گیان چند[1]۔ بقول ان کے یہ سب ایسے مشفق اُستاد تھے کہ جنھوں نے انھیں مٹی سے سونا بنایا۔ ویسے اتنا اندازہ تو میں نے بھی لگایا کہ اُنھوں نے اپنے اُستادوں کا ذکر قدرے فخر اور قدرے رقّت کے ساتھ کیا تھا۔

میں نے ان سے یہ بھی پوچھا تھا کہ آپ کن کن کتابوں سے متاثر ہوئے؟ کہنے لگے۔ قرآن حکیم، احمدیت اور حقیقی اسلام (جناب میرزا بشیر الدین محمود احمد)۔ اینا کرینا (ٹالسٹائی) اسٹورم (ایلبا اہرن برگ) وومن ان لو، (لارنس) فار ہوم دی بیل ٹولز (ہیمنگوے) مومنٹ اِن پیکنگ (لن یو ٹنگ)

---

[1] یہ گیان چند وہ نہیں جنھوں نے اُردو کی نثری داستانیں لکھ کر شہرت حاصل کی۔

بانگ درا اور بالِ جبرئیل (اقبال) نگارستان، جمالستان (نیاز فتحپوری) المامون (شبلی) اقبال کی ساری فارسی کتابیں، مثنوی مولانا رُوم، جوش کی رومانی نظمیں، اختر شیرانی کی رومانی نظمیں۔

دیکھ لیا آپ نے متاثر ہونے والی کتابوں میں پہلا نام تو اُنھوں نے قرآن حکیم کا لیا اور آخری ـــ جوش اور اختر شیرانی کی رومانی نظموں کا۔ لاریب اختر صاحب انہی دو جذبوں کے اندر بند ہیں اور ان جذبوں میں جو بُعد ہے وہ بھی ڈھکا چھپا نہیں۔ ایک طرف خُدا سے رشتہ ہے۔ دُوسری طرف اس کے "خاص" بندوں سے، انہی دو انتہائی جذبوں کی لٹک اور کھٹک کے سہارے یہ اپنی زندگی کو معطّر کیے ہوئے ہیں۔

اگر ان سے یہ پُوچھا جائے کہ آپ کن لوگوں سے متاثر ہوئے تو یہ فرفر جواب دیتے ہیں۔ مرحومین میں حضرت محمد صلعم، حضرت ابراہیمؑ، حضرت مُوسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ، میرزا غلام احمد، بودھ، کرشن، سعدی، اقبال، شیکسپیر، بابر، محمد بن قاسم، مہارانا پرتاپ سنگھ، ٹیپو سلطان، میر قاسم، شاہ ولی اللہ، پنڈت جواہر لعل نہرو، محمد علی جناح۔

زندوں میں ـــ میرزا بشیر الدین محمود احمد امام جماعت احمدیہ، ونسٹن چرچل[1]، پروفیسر

---

[1] ان دنوں چرچل زندہ تھے۔

پنکو بیٹے تو۔ اے (مصنّف ہو بیں ڈسٹرو ئے) اور سارے احباب، شکیلہ اختر اور اُرُول[1]۔

اور تو ساری باتیں ٹھیک ہو ئیں مگر یہ لیجیے یہ تو اپنی بیوی سے بھی متاثر نکلے یہ کلجگ والی بات ہے جو ذرا کم ہی سُننے میں آتی ہے۔ خواتین تو مارے زوجیت کے کہہ دیتی ہیں کہ ہیں اپنے شوہر سے متاثر ہُوں ـــ مگر ان کی زن پرستی کا حال اب کھُلا ہے۔ مُبارک ہو صاحب!

میرا خیال ہے یہ مُوڈ میں ہیں۔ اس لیے ان سے لگے ہاتھوں یہ بھی پُوچھ لیا جائے کہ آپ کن کن واقعات سے متاثر ہوئے۔ اس سوال کے بعد ہم ان سے کچھ نہ پوچھیں گے۔ صرف اپنی کہیں گے۔ ہاں تو جناب وہ واقعات بتائیں گے جن سے آپ متاثر ہوئے؟

سنو بھئی! کیا مصیبت میں جان ڈال رکھی ہے۔ میں متاثر ہُوا ہُوں جنگِ بدر، جنگِ حنین، جنگ قادسیہ، جنگ یرموک، واقعہ کربلا، فتح سندھ، جنگ پانی پت، جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء، تقسیم ہند ۱۹۴۷ء، انقلاب فرانس، اپنی والدہ کی موت (جب اختر صاحب ۱۴ سال کے تھے)

---

[1] ارول، شکیلہ اختر کی جنم بھُومی ہے مگر اختر صاحب اسے ایک شخصیت ہی سمجھتے ہیں۔

بچپا کی موت، اپنے بھتیجے اعجاز کی وفات — اور اپنی شادی سے!

لیجیے صاحب ہم لوگ اُن بھول بھلیاں سے نکل آئے جو محض ریاضی کے سوال تھے۔ اللہ تیرا شکر، جی چاہتا ہے کہ یہاں ایک کپ چائے پی جائے تاکہ حواس ٹھکانے لگیں۔

یہاں ایک دلچسپ قصہ سن لیجئے تاکہ ذہن کو ذرا سی آسودگی ملے عام طور پر ادن کی زندگی بڑی دلچسپ گزری۔ ادرین کے جنگلات و دریا میں سیر و شکار، مُرغابی سے لے کر شبیر تک، اردل میں دریائے سون میں تیراکی، کم و بیش روزانہ پکنک، تصویریں بنانا اور لڑکیوں سے بلے وقوف بننا۔ مثلاً:

بزرگوں اور لڑکیوں نے اردل میں سازش کی کہ ایک کمرہ پر جنات کا سایہ ہے۔ پٹنہ سے اختر صاحب آئے تو اُنھیں بیوقوف بنانے کے لیے پوری فضا تیار تھی۔ رات آتے ہی کھلی چھت پر بلبے تڑ تڑگے سفید پوش جن تشریف لائے اور غائب ہو گئے۔ لڑکیاں چیخیں اور بے ہوش ہو گئیں۔ سبز الائچیوں کی بارش ہوئی۔ مٹھائیوں کی ڈلیاں برسیں، اختر صاحب متاثر ہوئے مگر بظاہر دلیری کا اظہار کرتے رہے۔ سسرال اور سالیوں کے درمیان بُزدلی اور بہادری کا مسئلہ جو درپیش تھا۔

پھر یہ ہوا کہ زعفرانی تحریر میں خط آنے لگے۔ ہر روز رات کو یہ سوانگ

بھرا گیا۔ رونگٹے کھڑے ہوتے رہے۔ لڑکیاں ایکٹنگ کرتی رہیں۔ بالآخر اختر نے اپنی مذہبیت سے فائدہ اٹھایا اور ایک دن جنات کو عربی اور فارسی کے موٹے موٹے الفاظ میں ایک خطبہ دے ڈالا اور نصیحت فرمائی کہ اہلِ اسلام کو مت ستاؤ۔

کچھ دنوں کے بعد لڑکیاں چھوٹیں۔ کھل کھل ہنسیں۔ بعد کو پتہ چلا کہ یہ محض ڈرامہ تھا۔ اختر خفیف ہوئے اور شرمندگی اور خفگی کے مارے کئی دنوں تک اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑے رہے۔ آخر سالیوں نے منا لیا۔ جنوں کا سایہ تھا۔ پریوں نے دُور کیا۔

بہ حیثیت عالم فضل اللہ تعالیٰ کی ان پر خاص رحمت ہے۔ ہزاروں نے ان سے فیض اٹھایا ہو گا۔ مگر یہ ہیں کہ اپنے اس منصب سے مطمئن نہیں۔ ان کے سوچنے کا انداز اور ہے۔ یہ تو درس و تدریس کے مشغلے سے ہی خوش نہیں تھے یہ تو یہ چاہتے تھے کہ ڈاکٹر بن کے یورپ اور امریکہ جاتے اور تبلیغ اسلام کرتے۔ یہ ہے ان کی وہ آرزو جو پوری نہ ہوئی۔ چونکہ درس و تدریس کی 'دلدل' میں پھنسے ہوئے ہیں اس لیے کہہ دیتے ہیں کہ نہیں نہیں۔ یہ منصب بھی میری آرزوؤں کے مطابق ہے۔

ان ناتمام تمناؤں کے علاوہ ایک تمنا اور بھی ہے وہ یہ کہ چپ چاپ بستر پر لیٹے رہیں اور کوئی بھی انھیں پریشان نہ کرے ـــــ عموماً یہ "بیماری" ان لوگوں کو لاحق ہوتی ہے جو اپنے من کی بات دوسروں سے نہ کہہ سکتے ہوں اور یوں وہ تنہائی میں خیالوں کی "مجلسیں منعقد" کرتے ہیں اور خود کلامی میں لطف پاتے ہیں۔

بہماں تک میں نے انھیں پڑھنے کی کوشش کی پتہ یہی چلا کہ یہ کسی طرح بھی مطمئن نہ ہوتے۔ اب جب کہ یہ اپنی یونیورسٹی میں، اپنے شعبہ کے ہیڈ ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ اگر میں ڈاکٹر بنتا اور آزادانہ پریکٹس کرتا تو اچھا ہوتا۔ اگر یہ واقعی ڈاکٹر ہوتے تو یہ کہتے میں کہاں آپھنسا، یہ اپریشن، یہ کلی بڑی بیماریوں کی تشخیص اپنے بس کا روگ نہیں۔

ایک وقت میں یہ کہتے تھے کہ مجموعی طور پر شکیلہ سے اچھی نبھی ہے۔ یہ بڑی ایثار پسند اور وفا شعار ہیں لیکن مزاج میں تیزی اور سخت قسم کی انفرادیت ہے جو اکھرتی ہے۔ بہ فرضِ محال ان کی شادی اگر شکیلہ سے نہ ہوئی ہوتی تو اب تک یہ سنیاس لے چکے ہوتے۔

یہ اپنے معمولات میں بڑے باضابطہ ہیں۔ زندگی مقررہ سانچوں میں ڈھلی ہوئی ہے۔ بیماریوں نے اور بھی زیادہ بااصول بنا ڈالا۔ پروگرام میں ذرا بھی تبدیلی ہو جائے تو چڑچڑا جاتے ہیں لیکن کبھی کبھی بے ضابطہ بھی ہو جاتے ہیں مگر صرف احباب کے ساتھ! ورنہ زیادہ تر شوق، دھاتما بدھ بننے ہی کا ہے۔

طبیعت میں حد درجہ سنجیدگی اور باضابطگی کے ساتھ، خوش مزاجی اور ظرافت کی بھی چاشنی ہے۔ ہر وقت ابوالکلام بنے نہیں بیٹھے رہتے — "حلقۂ یاراں" کی تو جان ہیں یہ!

گزشتہ صفحات میں اُن کی زندگی کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑی ہوگی مگر ان کے مذہبی خیالات اور رجحانات پر ابھی کچھ مزید کہنے کی ضرورت ہے۔

اگر ہم مذہب کے بارے میں اُن کے خیالات جاننا چاہیں گے تو اس سلسلے میں یہ آپ بڑی بیباکی کے ساتھ کہیں گے۔ تمام مذاہب میں اسلام کو سب سے زیادہ ترقی یافتہ مذہب سمجھتا ہوں۔ زندگی گزارنے اور آفاقی تنظیم انسانیت کے لیے مذہب کو ضروری سمجھتا ہوں — اخلاق کا وسیع اور پائدار تصور بغیر مذہب کے ناممکن ہے۔ معمولی سطح پر، بغیر مذہب کے بھی قیام ممکن ہے لیکن رفعت و لطافتِ اخلاق جس کو روحانیت کہا جاتا ہے۔ صرف خدا تعالیٰ کی ذات کے اسلامی تصور سے حاصل ہو سکتی ہے۔

یہ غیر مذاہب کے لوگوں سے بھی رواداری اور تعصب نہیں برتتے۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ اسلام تعصب سے منع کرتا ہے۔ لا اکراہ فی الدین اور لا اکراہ فی المسلمین ان کا عقیدہ ہے۔ رشتہ داروں اور احباب میں شیعہ، سُنی وہابی، حنفی، دہریہ، اشتراکی، اشتمالی، ہندو، عیسائی سبھی ہیں اور سبھوں سے اچھے تعلقات ہیں عقیدتاً بھی دوسرے مذاہب کے لوگوں کو واصلِ جہنم نہیں کرتے۔ نجات کا معاملہ صرف خدا اور بندے کا معاملہ سمجھتے ہیں۔

سیاسی اعتبار سے یہ اسلامی جمہوریت اور خلافت کے قائل ہیں۔ اسلامی اقتصادی نظام جس میں اشتراکیت کی خوبی اور حصولِ دولت کی سہولتیں موجود ہوں،

اسلامی نظام میں بھی اخلاق کو ضروری سمجھتے ہیں۔ حُبِ وطن کے قائل ہیں مگر وفاقِ عالم
ضروری سمجھتے ہیں۔ قومیت کے بارے میں اقبال کا یہ شعر گنگناتے رہتے ہیں ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

حکومتِ وقت کی اطاعت بھی ضروری سمجھتے ہیں مگر تنقید اور حُریتِ ضمیر کے ساتھ!

میں آپ کے صبر و تحمل کی داد دیتا ہوں کہ آپ نے باغ و بہار قسم کے آدمی کے بارے میں میری ژولیدہ نگاری کو برداشت کیا۔ مگر ابھی میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ تھوڑے سے صبر سے اور کام لیں تاکہ ان کے ادبی نظریات اور پسند کے بارے میں بھی بات چیت ہو سکے۔

ہر آدمی کے بارے میں یہ جاننا شاید ضروری نہ ہو کہ وہ اپنے آپ کو کتنی اہمیت دیتا ہے مگر ایک ادیب کے بارے میں یہ جاننا ضروری ہے۔ اس سوال کی روشنی میں اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو یہ اپنے آپ کو بھی اچھی خاصی اہمیت دیتے ہیں لیکن کبر نہیں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ تنقید صحیح کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی تخلیقات کو بھی کم قیمت نہ سمجھا جائے اور یہ بھی کہ جس نے خود کو پہچانا اور اپنی حقیقت کو پہچانا وہ بڑا دعوے بھی نہیں کر سکتا۔

ٹوہ لینے پر معلوم ہوا کہ ان کے پسندیدہ ادیبوں میں ایلیٹ، رکیسلے، کیفکا،

اشٹین بک، خلیل جبران، لطفی منفلوطی، ٹیگور، نظیر اکبر آبادی، انیس، غالب، اقبال، شاد عظیم آبادی، مرزا رسوا، پریم چند، محمد حسین آزاد، شبلی، حالی، ڈپٹی نذیر احمد، منٹو اور اختر شیرانی — اور — جوش ملیح آبادی، نیاز فتحپوری، آل احمد سرور، احتشام حسین، کلیم الدین احمد، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین، روشن صدیقی اور احمد ندیم قاسمی ہیں۔

یہ ساری یادداشتیں وہ ہیں جو میں ان سے اچک لایا تھا۔ انھیں ہضم کر کے لکھنے کے لیے مسلسل ملاقاتوں کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد جو کچھ لکھا جاتا وہ زیادہ کارآمد ہوتا۔ مگر میں کیا کروں۔ اختر اورینوی نمبر[1] میری مزید ملاقاتوں کے لیے رک نہیں سکتا۔

اس نمبر میں میری شرکت ضروری تھی۔ خواہ صورت وہی کچھ ہو جو یوسف کی خریداری کے سلسلے میں روئی کی انٹی والی بڑھیا کو پیش آئی تھی۔

---

[1] یہ مضمون رسالہ "صبح نو" پٹنہ کے اختر اورینوی نمبر کیلئے لکھا گیا تھا۔
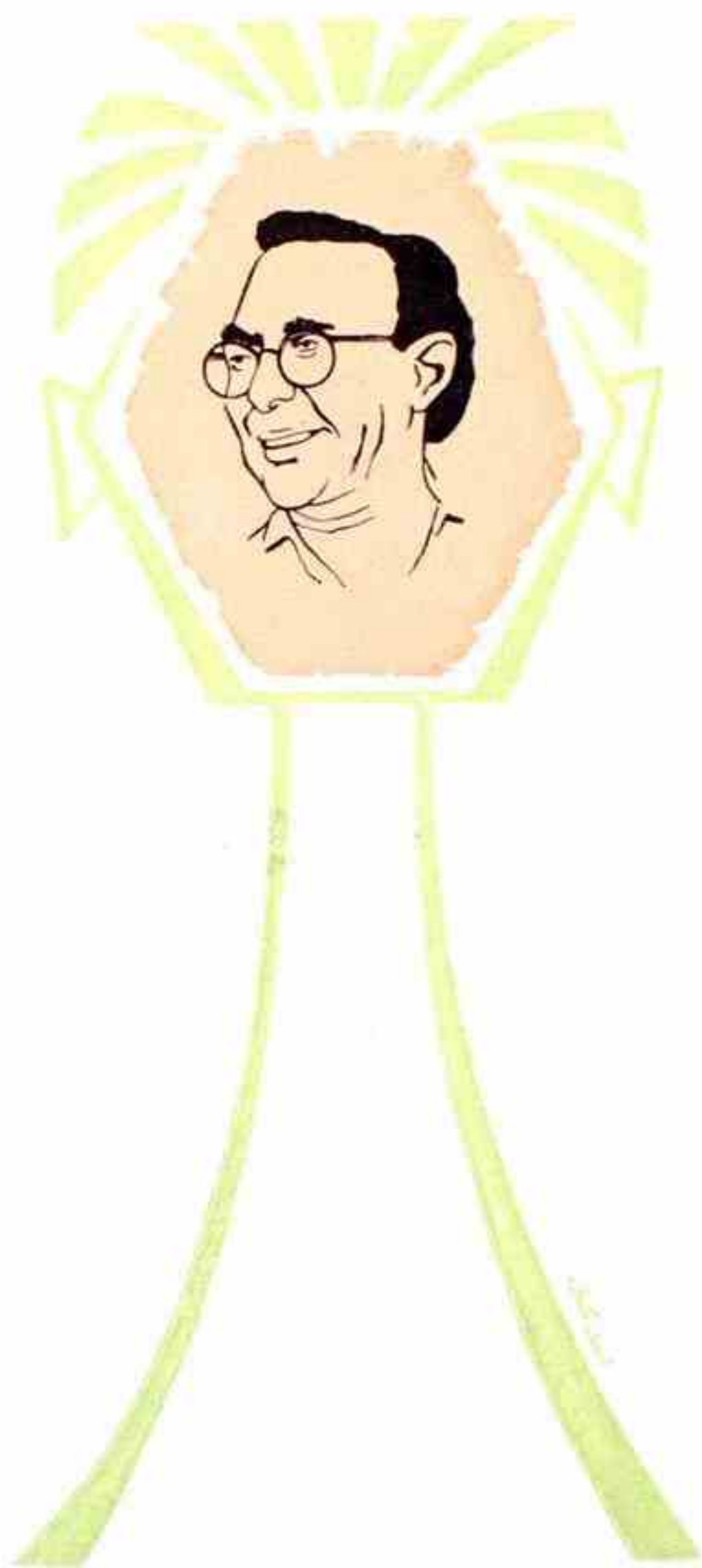
کرشن چندر

میں یہ مضمون کسی دیوتا یا اوتار کے بارے میں نہیں لکھنے لگا ہوں۔

پلیز یہ بات دھیان میں رکھ لیجئے گا۔ ہاں! اب چلیے میرے ساتھ!

یہ صاحب جن کے بارے میں مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ بہت بڑے افسانہ نگار ہیں۔ اگر کوئی ایسا شخص ان کے بارے میں لکھتا، جس کی تحریر میں افسانویت زیادہ ہوتی تو مضمون کچھ زیادہ ہی نشان دار ہوتا۔ موجودہ صورت تو صبر شکر والی ہے۔

کرشن چندر نے مجھے اپنے پچیس جنوری ۱۹۵۱ء کے خط میں لکھا تھا۔ "میری زندگی میں آپ کا یہ پہلا خط ہے۔ جو مجھے مل رہا ہے۔" گویا تحریری تعلقات کو سولھواں برس چل رہا ہے۔ لیجئے تعلقات تو بالغ ہو گئے۔

۱۹۶۱ء میں کرشن چندر کو صورتاً بھی دیکھ لیا۔

چونکہ میں ان سے ایک مدت کے بعد ملا تھا۔ اس لیے مجھ پر مطالعے سے زیادہ سرشاری کی سی کیفیت طاری تھی۔ اُن دنوں خیال یہ بھی تھا کہ اب تو ان کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا رہے گا۔ لہٰذا بچ کے کہاں جائیں گے۔ مگر کرنا خدا کا یہ ہوا کہ پھر اُدھر جانا ہی نہیں ہوا۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ یہ موقع پھر ہاتھ نہ آئے گا تو میں اُن دنوں کے ہر لمحے کو اپنی تحریر میں قید کر لیتا۔ یا یہ کہ وہیں دھرنا مار کے بیٹھ جاتا۔

پہلے مجھے کرشن چندر کے فن سے محبت ہوئی۔ پھر ذات سے یوں میں نے افسانوی قطب مینار پر سیڑھی بہ سیڑھی قدم رکھا۔

میں نے کرشن چندر کا پہلا افسانہ زندگی کے موڑ پر پڑھا تھا۔ میرے دو ایک دوستوں نے ورغلایا وہ افسانہ پڑھ لینا۔ ورنہ پچھتاؤ گے۔ میں پچھتانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے چپکے سے افسانہ ہی پڑھ ڈالا۔ اب میں کہتا ہوں کہ اُس افسانے کا پڑھنا بُرا ہی ہوا۔ وہ دن اور آج کا دن کہ کرشن چندر کی ہر تحریر کو پڑھنا پڑا۔ یہ کوئی کم ہرجانہ ہے کرشن چندر کے فن کا؟

دوسرے افسانہ نگاروں کی طرح 'مجھے ان کے افسانے' افسانے معلوم نہیں ہوتے بلکہ محسوس ہوتا ہے کہ پرکاش چند کوئی ہے اور پرکاش وتی کوئی ہے۔ یہ ہماری واقفیت افسانوی کرداروں سے نہیں کراتے بلکہ زندہ افسانوں سے ملاقات کراتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میرے دوستوں کا حلقہ وسیع

کا میچ دیکھتا رہا ـــــ لاہور سے میچ دیکھنے اور آپ سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔ ایک کام ختم ہوگیا۔ دوسرا اب شروع ہوا ہے۔"

"اچھا تو آپ کو دلّی آئے ہوئے اکٹھے سات روز گزر چکے ہیں۔"

"جی ہاں!"

"ہم سے تو گیند بلّا ہی اچھا ہوا جسے آپ نے پہلے نوازنا پسند کیا۔"

"جی یہ بات نہیں۔ وہ "وقتی نشہ" تھا۔ جواب اُترنا شروع ہوگیا ہے مگر آپ کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔"

"میرا نشہ کب تک رہے گا؟"

"خیال تو یہی ہے کہ زندگی بھر ـــــ"

"اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو۔ مگر مجھے پہلے جلدی سے یہ بتا دو کہ احمد ندیم قاسمی کیسے ہیں؟ چودھری نذیر احمد کیسے ہیں؟ مولانا صلاح الدین احمد کیسے ہیں؟"

"سب اچھے ہیں۔ سب مزے میں ہیں۔"

"یہ لوگ مزے میں کیسے ہو سکتے ہیں؟ اس لئے کہ ان کا تعلق ادب سے ہے۔"

یہ دور چونکہ ابھی ادب کے خدمت گزاروں کے لئے سازگار نہیں۔

اس لئے کرشن چندر کے اس فقرے کی چبھن محسوس ہوتی ہی رہے گی۔

اس کے بعد بڑی حسرت سے پوچھا۔ "میرے لاہور کا کیا حال ہے؟"

یہ مجھ غریب پر کرشن چندر کا دوسرا حملہ تھا، میں نے پسپا ہوتے ہوئے کہا۔

جیسا آپ چھوڑ آئے تھے۔ ویسا ہی ہے۔"

"کیا اب بھی شام کو ویسی ہی انار کلی میں رونق ہوتی ہے؟ کیا اب بھی شام کو ویسے ہی جوڑے بن سنور کے نکلتے ہیں؟ کیا اب بھی ویسے ہی چائے خانوں میں ادبی موضوعات پر باتیں ہوتی ہیں۔ کیا اب بھی ویسے ہی ۔۔۔"

میں کرشن چندر کے تابڑ توڑ سوالوں سے گھبرا گیا۔ وہ بے حد جذباتی ہو رہے تھے۔ مجھے نظر آرہا تھا کہ وہ ابھی رونا شروع کر دیں گے۔ اس لئے میں نے باتوں کا رُخ بدلنا چاہا ۔۔۔ "مجھے آپ کا ڈرائنگ روم بڑا پسند آیا۔"

میری اس چالاکی پر وہ بڑی زہریلی ہنسی ہنسے، جیسے کہہ رہے ہوں مجھے بیوقوف نہ بناؤ۔

دوسرے دن انھوں نے مجھے کھانے کی دعوت دی۔ ایک پُرتکلف دعوت۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ ایک ہندو کے ہاں کھانے کا کیا لطف آئے گا۔ دہی بھاجی ترکاری ہوگی۔ مگر وہاں تو معاملہ انگلیاں چاٹنے والا نکلا۔ ایک سے ایک عمدہ کھانا اور وہ گاجر کا حلوا تو مجھے آج تک نہیں بھولا۔ اور کھانے ہی سے متعلق مجھے کرشن چندر کا وہ فقرہ بھی نہیں بھولتا کہ "فرسٹ کلاس عشق کرنے کے لئے فرسٹ کلاس کھانے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔"

کھانے کے بعد کرشن چندر نے، ازرہِ کرم مجھے اپنا ایک افسانہ سنایا۔ میری فرمائش کے بغیر، اس لیے کہ شاعروں سے شعروں کی فرمائش تو کی جاسکتی ہے

مگر افسانہ نگاروں سے افسانہ سنانے کی فرمائش نہیں کی جاسکتی۔ مگر یہ کرشن چندر کی محبّت تھی کہ انھوں نے مجھے اس طرح بھی نواز نا پسند کیا۔ نثر میں تو یہ شاعری کرتے ہی ہیں۔ اس طرح لطف دوبالا ہوگیا۔ یوں شعر بھی سُن لئے، نثر بھی سُن لی۔

افسانہ سنا چکنے کے بعد، انھوں نے کہا کہ میں نے اس افسانے کا اختتام ایک اور طرح سے بھی کیا ہے۔ وہ بھی سُن لیجئے اور پھر بتائیے کہ ان دونوں میں سے کونسا اختتام بہتر ہے۔ سننے کے بعد میں نے اپنی رائے کا اظہار کر دیا۔ اتفاق کی بات کہ ہم دونوں کی رائے ایک تھی۔ اس لئے کرشن چندر بھی مطمئن ہوگئے اور میں بھی خوش ہوگیا۔

اس کے بعد انھوں نے مجھے مختلف ادیبوں کے چھوٹے چھوٹے اسکیچ سنائے۔ جو بڑے پیارے تھے۔ اور اپنی جگہ شخصی اور فنی مطالعہ کے حسین امتزاج۔ ان کے بارے میں بھی، انھوں نے میری رائے پوچھی۔ میری رائے ہی کیا ہوتی۔ بہرحال دیر تک سر دھنتا رہا۔ لیکن اس کے ساتھ مجھے جہاں کہیں اعتراضات تھے وہ وہ بھی عرض کر دیئے۔ اس وقت تو وہ خاموش رہے مگر دوسری ملاقات پر بتایا کہ میں نے آپ کی باتوں پر غور کیا تو وہ مجھے معقول نظر آئیں۔ اس لئے میں نے اسکیچوں میں آپ کی رائے کے مطابق تبدیلی کر لی ہے۔ اس واقعہ سے میں بے حد خوش ہوا۔ خوشی والی بات یہ نہ تھی کہ انھوں نے میری گزارشات کو قبول کیا تھا بلکہ یہ کہ کرشن چندر اتنا بڑا ادیب ہو کر بھی، کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں۔ بلکہ فن کی

لگن میں، وہ مجھ ایسے عام آدمی کی بات پر بھی کان دھرتے ہیں۔ یہ ایک اتنی بڑی خوبی ہے۔ جو سب کے لئے قابلِ تقلید ہونی چاہیے۔ مگر کوئی ایسا دل گردہ لائے کہاں سے!

دورانِ گفتگو انھوں نے مجھے بتایا کہ وہ میرے اسکیچوں کو پسند کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں نے اپنے اسکیچوں کے دوسرے مجموعے "جناب" کے بارے میں کہا کہ اس پر کچھ لکھ دیجئے۔ انھوں نے بہ خوشی حامی بھر لی۔

میرے لاہور واپس آجانے کے بعد، انھوں نے مجھے اپنا مضمون بھجوا دیا۔ جس کے سلسلے میں ان کا آج بھی ممنون ہوں۔ مگر انھوں نے جو میرا حلیہ کھینچا تھا۔ وہ میرا نہ تھا۔ کچھ ایسا تھا کہ میں ـــ "پہلی بار جب محمد طفیل میرے کمرے میں داخل ہوئے تو پہلی نظر میں وہ مجھے سجادہ نشین نظر آئے۔ دوسری نظر میں لکڑیوں کے ٹال کے مالک، تیسری نظر میں ایک معصوم سے بچے، جو وقت سے پہلے بڑا ہو جائے۔ چوتھی نظر کا انھوں نے مجھے موقع ہی نہیں دیا۔ اس وقت تک وہ مجھ سے بغلگیر ہو چکے تھے۔"

آگے چل کر لکھا ـــ "لکڑیوں کے اس گٹھے میں، جس کا نام 'جناب' ہے۔ ہر طرح کی لکڑی ہے۔ موٹی اور پتلی بھی، نئی اور پرانی بھی، گیلی اور سوکھی بھی، مگر ادیبوں کا یہ پشتارہ ہے بے حد دلچسپ! صفحہ اوّل سے آخر تک یہ کاغذی زنبیل گوناگوں جادو رنگ کیفیتوں سے معمور ہے اور ان میں ہر لکڑی جلتی ہے۔ کوئی پطرس کی طرح

پٹاخے چلاتی ہے تو کوئی میرزا ادیب کی طرح رُک رُک کر چلتی ہے۔ کوئی شکیلہ اختر کی طرح ایک ہی رنگ میں چلتی چلی جاتی ہے تو کوئی مجاز کی طرح راکھ ہو چکی ہے۔"

جب یہ مضمون مجھے ملا تھا تو میں نے شکریے کا خط لکھا تھا جس میں یہ رقم تھا کہ "مضمون مجھے پسند آیا۔ مگر جنھیں میری ذات سے محبت ہے۔ وہ حیران ہیں" اس فقرے سے کرشن چندر یہ سمجھے کہ مجھے مضمون پسند نہیں آیا۔ حالانکہ یہ بات نہ تھی۔ میرا اشارہ اپنی ذات سے متعلق تھا۔ یعنی حلیے سے متعلق، مگر وہ کچھ اور سمجھے۔

آج سوچتا ہوں تو یہ بات دھیان میں آتی ہے کہ کرشن چندر کو مجھے اس قسم کا خط نہیں لکھنا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ انھوں نے مجھے لکڑیوں کے ٹال کا مالک ضرورتاً بنایا تھا۔ کیونکہ مضمون لکھتے وقت کچھ نادر تشبیہات ان کے ذہن میں اُمڈ آئی تھیں۔ جن سے انھیں فائدہ اٹھانا تھا۔ سو انھوں نے اس رعایت سے خوب فائدہ اٹھایا ـــــ ہمیں بھی اس کا ایک فائدہ ہوا وہ یہ کہ ان کی زندگی کا ایک رخ سامنے آگیا۔

ہاں تو، میرے "شکایتی خط" کے جواب میں انھوں نے لکھا تھا ـــــ "آپ کا خط مل گیا۔ میں نے پرانی قسم کی بھرپور تعریف نہیں کی تھی۔ ہنسی مذاق میں اور Understatement میں بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ تبصرے کا پرانا انداز اب کچھ اکھرنے لگا ہے۔ آپ کو نہیں اکھرتا ہے کیا؟ بہرحال اگر آپ کو

تبصرہ پسند نہیں آیا تو میں اسے اپنی بد قسمتی پر محمول کر سکتا ہوں۔ اپنی بدنیتی پر نہیں۔ آپ کی تیسری کتاب پر انشاءاللہ کسر نکال دوں گا۔ ویسے وہ تبصرہ میں نے بخار کی حالت میں جب 103 ٹمپریچر تھا لکھا تھا۔ تاکہ آپ کو وقت پر مل جائے۔ صاحب اور جناب دونوں کتابیں مجھے پسند ہیں۔ ان کے اندر اشائل کی ایک تازگی ہے۔ آپ نے انسانوں کو انسانوں کی طرح دیکھا ہے دیوتاؤں کی طرح نہیں۔ یہی تو اس کی خوبی ہے اور اسی طرح سے میں نے آپ کی کتابوں کو دیکھا اور پڑھا ہے۔"

اپنے بارے میں یا اپنی کتابوں کے بارے میں لکھنے کا مجھے کوئی شوق نہیں۔ میرے خلاف یا موافق اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اب مجھے کوئی ہوس باقی نہیں رہی۔ میں نے ایسا صرف ایک نکتے کی وضاحت کے لیے کیا ہے اور وہ یہ کہ انھیں کسی کی بھی دل آزاری پسند نہیں۔ صُلح کل قسم کے آدمی ہیں اور پھر یہ احساس کہ دوست کی بات بروقت سُنی جائے چاہے ٹمپریچر ایک سو تین ہی کیوں نہ ہو۔

ان کے دل میں دوستوں کے لیے بھی بہت سی جگہ ہے۔ خلوص ہے۔ پیار ہے۔ غرض کہ وہ سب کچھ ہے، جو آج کل دوستی کے سلسلے میں کمیاب ہے۔ زیادہ تفصیل میں نہیں جاتا۔ تاکہ کہیں "مہابکو" نہ سمجھ لیا جاؤں۔ مختصراً یہ کہ انھوں نے مجھے ایک بار لکھا تھا:۔

"فیضؔ دو روز کے لیے ہمارے اصرار پر بمبئی آئے تھے۔ دو دن ہوتے ہی کیا ہیں۔ وقت اس قدر کم تھا کہ طے کیا گیا کہ کم و بیش جہاں تک ہوسکے سونے سے احتراز کیا جائے اور شب و روز ساتھ رہا جائے۔ چنانچہ اکثر احباب فیضؔ سمیت اڑتالیس گھنٹے نہیں سوئے اور شعر و شاعری کی نان اسٹاپ محفل چلتی رہی۔ فیضؔ پرسوں واپس چلے گئے تو یار لوگ اب سو کر کسر پوری کر رہے ہیں۔ بہر حال فیضؔ کے کلام سے "فیض یاب" ہونے کے لیے کئی راتوں کے لیے جاگا جا سکتا ہے ایسے موقعے روز روز کہاں ملتے ہیں۔"

یہ اڑتالیس گھنٹے جاگنا صرف فیضؔ کے کلام کی وجہ نہیں ہوسکتی۔ بلکہ فیض صاحب سے جو ذاتی مراسم تھے۔ وہ انھیں سونے نہیں دیتے تھے۔ جہاں تک کلام کا تعلق ہے وہ تو کتابوں کی صورت میں چھپا ہوا موجود ہی تھا۔

قارئین ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں بڑی اونچی رائے رکھتے ہیں اور یہ لوگ اپنی چھوٹی موٹی خامیوں کے باوجود واقعی ہوتے بھی قابلِ پرستش ہیں۔ (بشرطیکہ سچا فن کار ہو) لیکن یہ لوگ کس طرح جیتے ہیں؟ ان کے مسائل کیا ہیں؟ یہ سب نہیں جانتے۔ ان کے سینوں میں ایک تو مخلوقِ خدا کے دکھ ہوتے ہیں۔ اُن پہ مستزاد ذاتی دُکھ، جب تک معاشرے میں ناہمواری ہے۔ ناانصافی ہے۔ دکھ درد ہے۔ یہ لوگ سولی پہ ہی لٹکے رہیں گے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ادیب لوگ اپنی ذاتی ذمہ داریوں کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ میں اِس بات کو نہیں مانتا۔ وہ ادیب ہی نہیں جسے اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہ ہو۔ اسی ضمن میں کرشن چندر کے ایک اور خط کی طرف لوٹتا ہوں:۔

"میں ایک ماہ کے لیے دہلی جا رہا ہوں۔ ممکن ہے وہاں اس سے زیادہ عرصے کے لیے رہنا پڑ جائے۔ در اصل میری بچّی جو گزشتہ چھ سال سے علیل چلی آتی ہے۔ میرے لیے شدید ترین اور تکلیف دہ مسئلہ بن چکی ہے۔ ان دنوں یکایک اس کی ذہنی حالت اس قدر مخدوش ہو گئی ہے کہ میں پرسوں اسے لے کر دہلی جا رہا ہوں۔ جہاں امریکہ سے اس مرض کے علاج کے لیے ایک نئے ماہر آئے ہیں۔ علاج کرا کے دیکھوں گا۔ کچھ چھ سال میں اتنے علاج کرائے ہیں اور اتنا پیسہ پھونکا ہے کہ اب دل میں کسی طرح کی امید باقی نہیں رہی اور ذہن پر تلخی سی بھی چھانے لگی ہے۔ بہرحال کوشش کرنا انسان کا فرض ہے۔"

اس خط کے ملنے کے کچھ عرصہ بعد، میں پٹنہ گیا تھا۔ شکیلہ آپا نے مجھے بتایا کہ پچھلے دنوں کرشن یہاں آئے تھے اور اپنی پاگل بچّی کو بھی ساتھ لائے تھے۔ ان کی جوان بچّی پاگل ہو گئی ہے۔ جسے انھوں نے رانچی کے پاگل خانے میں داخل کرا دیا ہے۔ خود کرشن چندر کا بھی بہت بُرا حال تھا۔ بے حد پریشان تھے۔ مجھے تو خطرہ نظر آ رہا ہے کہ کہیں بیٹی کے بعد، باپ بھی پاگل نہ ہو جائے۔"

کا میچ دیکھتا رہا ـــــ لاہور سے میچ دیکھنے اور آپ سے ملنے کے لیے آیا ہوں
ایک کام ختم ہو گیا۔ دوسرا اب شروع ہوا ہے۔"

"اچھا تو آپ کو دلی آئے ہوئے اکٹھے سات روز گزر چکے ہیں۔"

"جی ہاں!"

"ہم سے تو گبند بلا ہی اچھا ہوا جسے آپ نے پہلے نوازنا پسند کیا۔"

"جی یہ بات نہیں۔ وہ "وقتی نشہ" تھا۔ جواب اُترنا شروع ہو گیا ہے۔
مگر آپ کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔"

"میرا نشہ کب تک رہے گا؟"

"خیال تو یہی ہے کہ زندگی بھر ـــــ"

"اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو۔ مگر مجھے پہلے جلدی سے یہ بتا دو کہ احمد ندیم قاسمی
کیسے ہیں؟ چودھری نذیر احمد کیسے ہیں؟ مولانا صلاح الدین احمد کیسے ہیں؟"

"سب اچھے ہیں۔ سب مزے میں ہیں۔"

"یہ لوگ مزے میں کیسے ہو سکتے ہیں؟ اس لئے کہ ان کا تعلق ادب سے ہے۔"
یہ دور چونکہ ابھی ادب کے خدمت گزاروں کے لئے سازگار نہیں۔
اس لئے کرشن چندر کے اس فقرے کی چبھن محسوس ہوتی ہی رہے گی۔

اس کے بعد بڑی حسرت سے پوچھا۔ "میرے لاہور کا کیا حال ہے؟"
یہ مجھ غریب پر کرشن چندر کا دوسرا حملہ تھا۔ میں نے پسپا ہوتے ہوئے کہا۔

جیسا آپ چھوڑ آئے تھے ۔ ویسا ہی ہے ۔"

"کیا اب بھی شام کو ویسی ہی انارکلی میں رونق ہوتی ہے؟ کیا اب بھی شام کو ویسے ہی جوڑے بن سنور کے نکلتے ہیں؟ کیا اب بھی ویسے ہی چائے خانوں میں ادبی موضوعات پر باتیں ہوتی ہیں ۔ کیا اب بھی ویسے ہی ——"

میں کرشن چندر کے تابڑ توڑ سوالوں سے گھبرا گیا ۔ وہ بے حد جذباتی ہو رہے تھے ۔ مجھے نظر آ رہا تھا کہ وہ ابھی رونا شروع کر دیں گے ۔ اس لئے میں نے باتوں کا رُخ بدلنا چاہا —— "مجھے آپ کا ڈرائنگ روم بڑا پسند آیا ۔"

میری اس چالاکی پر وہ بڑی زہریلی ہنسی ہنسے ، جیسے کہہ رہے ہوں ۔ مجھے بے وقوف نہ بناؤ ۔

دوسرے دن انھوں نے مجھے کھانے کی دعوت دی ۔ ایک پُر تکلف دعوت ، پہلے میں نے سوچا تھا کہ ایک ہندو کے ہاں کھانے کا کیا لطف آئے گا ۔ دہی بھاجی ترکاری ہوگی ۔ مگر وہاں تو معاملہ انگلیاں چاٹنے والا نکلا ۔ ایک سے ایک عمدہ کھانا اور وہ گاجر کا حلوا تو مجھے آج تک نہیں بھولا ۔ اور کھانے ہی سے متعلق مجھے کرشن چندر کا وہ فقرہ بھی نہیں بھولتا کہ "فرسٹ کلاس عشق کرنے کے لئے فرسٹ کلاس کھانے کی بھی ضرورت ہوتی ہے ۔"

کھانے کے بعد کرشن چندر نے ، از رہِ کرم مجھے اپنا ایک افسانہ سنایا ۔ میری فرمائش کے بغیر ، اس لیے کہ شاعروں سے شعروں کی فرمائش تو کی جاسکتی ہے

مگر افسانہ نگاروں سے افسانہ سنانے کی فرمائش نہیں کی جا سکتی۔ مگر یہ کرشن چندر کی محبت تھی کہ انھوں نے مجھے اس طرح بھی نوازنا پسند کیا۔ نثر میں تو یہ شاعری کرتے ہی ہیں۔ اس طرح لطف دوبالا ہو گیا۔ یوں شعر بھی سُن لئے، نثر بھی سُن لی۔

افسانہ سنا چکنے کے بعد، انھوں نے کہا کہ میں نے اس افسانے کا اختتام ایک اور طرح سے بھی کیا ہے۔ وہ بھی سُن لیجئے اور پھر بتائیے کہ ان دونوں میں سے کونسا اختتام بہتر ہے۔ سننے کے بعد میں نے اپنی رائے کا اظہار کر دیا۔ اتفاق کی بات کہ ہم دونوں کی رائے ایک تھی۔ اس لئے کرشن چندر بھی مطمئن ہو گئے اور میں بھی خوش ہو گیا۔

اس کے بعد انھوں نے مجھے مختلف ادیبوں کے چھوٹے چھوٹے اسکیچ سنائے۔ جو بڑے پیارے تھے۔ اور اپنی جگہ شخصی اور فنی مطالعہ کے حسین امتزاج، ان کے بارے میں بھی، انھوں نے میری رائے پوچھی۔ میری رائے ہی کیا ہوتی۔ بہرحال دیر تک سر دُھنتا رہا۔ لیکن اس کے ساتھ مجھے جہاں کہیں اعتراضات تھے وہ وہ بھی عرض کر دئیے۔ اس وقت تو وہ خاموش رہے مگر دوسری ملاقات پر بتایا کہ میں نے آپ کی باتوں پر غور کیا تو وہ مجھے معقول نظر آئیں۔ اس لئے میں نے اسکیچوں میں آپ کی رائے کے مطابق تبدیلی کر لی ہے۔ اس واقعہ سے میں بے حد خوش ہوا۔ خوشی والی بات یہ نہ تھی کہ انھوں نے میری گزارشات کو قبول کیا تھا بلکہ یہ کہ کرشن چندر اتنا بڑا ادیب ہو کر بھی، کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں۔ بلکہ فن کی

لگن میں، وہ مجھ ایسے عام آدمی کی بات پر بھی کان دھرتے ہیں۔ یہ ایک اتنی بڑی خوبی ہے۔ جو سب کے لئے قابلِ تقلید ہونی چاہیے۔ مگر کوئی ایسا دل گردہ لائے کہاں سے!

دورانِ گفتگو انھوں نے مجھے بتایا کہ وہ میرے اسکیچوں کو پسند کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں نے اپنے اسکیچوں کے دوسرے مجموعے "جناب" کے بارے میں کہا کہ اس پر کچھ لکھ دیجئے۔ انھوں نے بہ خوشی حامی بھر لی۔

میرے لاہور واپس آجانے کے بعد، انھوں نے مجھے اپنا مضمون بھجوا دیا۔ جس کے سلسلے میں ان کا آج بھی ممنون ہوں۔ مگر انھوں نے جو میرا حلیہ کھینچا تھا۔ وہ میرا نہ تھا۔ کچھ ایسا تھا کہ میں — "پہلی بار جب محمد طفیل میرے کمرے میں داخل ہوئے تو پہلی نظر میں وہ مجھے سجادہ نشین نظر آئے۔ دوسری نظر میں لکڑیوں کے ٹال کے مالک، تیسری نظر میں ایک معصوم سے بچّے، جو وقت سے پہلے بڑا ہو جائے۔ چوتھی نظر کا انھوں نے مجھے موقع ہی نہیں دیا۔ اس وقت تک وہ مجھ سے بغلگیر ہو چکے تھے۔"

آگے چل کر لکھا — "لکڑیوں کے اس گٹھے میں، جس کا نام 'جناب' ہے۔ ہر طرح کی لکڑی ہے۔ موٹی اور پتلی بھی، نئی اور پرانی بھی، گیلی اور سوکھی بھی، مگر ادیبوں کا یہ پشتارہ ہے بے حد دلچسپ! صفحہ اوّل سے آخر تک یہ کاغذی زنبیل گوناگوں جادو رنگ کیفیتوں سے معمور ہے اور اس میں ہر لکڑی جلتی ہے۔ کوئی پطرس کی طرح

بیانخے چلاتی ہے تو کوئی میرزا ادیب کی طرح رُک رُک کر چلتی ہے۔کوئی شکیلہ اختر کی طرح ایک ہی رنگ میں چلتی چلی جاتی ہے تو کوئی مجاز کی طرح راکھ ہو چکی ہے۔"

جب یہ مضمون مجھے ملا تھا تو میں نے شکریے کا خط لکھا تھا۔جس میں یہ رقم تھا کہ "مضمون مجھے پسند آیا۔مگر جنھیں میری ذات سے محبت ہے۔وہ حیران ہیں" اس فقرے سے کرشن چندر یہ سمجھے کہ مجھے مضمون پسند نہیں آیا۔حالانکہ یہ بات نہ تھی۔میرا اشارہ اپنی ذات سے متعلق تھا۔یعنی حُلیے سے متعلق، مگر وہ کچھ اور سمجھے۔

آج سوچتا ہوں تو یہ بات دھیان میں آتی ہے کہ کرشن چندر کو مجھے اس قسم کا خط نہیں لکھنا چاہیے تھا۔اس لیے کہ انھوں نے مجھے لکڑیوں کے ٹال کا مالک ضرورتاً بنایا تھا۔کیونکہ مضمون لکھتے وقت کچھ نادر تشبیہات ان کے ذہن میں اُمڈ آئی تھیں۔جن سے انھیں فائدہ اٹھانا تھا۔سو انھوں نے اس رعایت سے خوب فائدہ اٹھایا۔ ہمیں بھی اس کا ایک فائدہ ہوا وہ یہ کہ ان کی زندگی کا ایک رخ سامنے آگیا۔

ہاں تو، میرے "شکایتی خط" کے جواب میں انھوں نے لکھا تھا۔ "آپ کا خط مل گیا۔میں نے پرانی قسم کی بھرپور تعریف نہیں کی تھی۔ہنسی مذاق میں اور Understatement میں بات کرنے کی کوشش کی تھی۔تبصرے کا پرانا انداز اب کچھ اکھرنے لگا ہے۔آپ کو نہیں اکھرتا ہے کیا؟ بہرحال اگر آپ کو

تبصرہ پسند نہیں آیا تو میں اسے اپنی بدقسمتی پر محمول کر سکتا ہوں - اپنی بدنیتی پر
نہیں - آپ کی تیسری کتاب پر انشاء اللہ کسر نکال دوں گا - ویسے وہ تبصرہ میں
نے بخار کی حالت میں جب 103 ٹمپریچر تھا لکھا تھا - تاکہ آپ کو وقت پر مل
جائے - صاحب اور جناب دونوں کتابیں مجھے پسند ہیں - ان کے اندر اسٹائل
کی ایک تازگی ہے - آپ نے انسانوں کو انسانوں کی طرح دیکھا ہے دیوتاؤں
کی طرح نہیں - یہی تو اس کی خوبی ہے اور اسی طرح سے میں نے آپ کی کتابوں
کو دیکھا اور پڑھا ہے "

اپنے بارے میں یا اپنی کتابوں کے بارے میں لکھنے کا مجھے کوئی شوق
نہیں - میرے خلاف یا موافق اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اب مجھے کوئی ہوس باقی
نہیں رہی - میں نے ایسا صرف ایک نکتے کی وضاحت کے لیے کیا ہے اور وہ یہ
کہ انھیں کسی کی بھی دل آزاری پسند نہیں - صُلحِ کل قسم کے آدمی ہیں اور پھر یہ
احساس کہ دوست کی بات بر وقت سُنی جائے چاہے ٹمپریچر ایک سو تین
ہی کیوں نہ ہو -

ان کے دل میں دوستوں کے لیے بھی بہت سی جگہ ہے - خلوص ہے -
پیار ہے - غرض کہ وہ سب کچھ ہے، جو آج کل دوستی کے سلسلے میں کمیاب ہے -
زیادہ تفصیل میں نہیں جاتا - تاکہ کہیں "دھابکو" نہ سمجھ لیا جاؤں - مختصراً یہ کہ انھوں
نے مجھے ایک بار لکھا تھا :-

"فیضؔ دو روز کے لیے ہمارے اصرار پر بمبئی آئے تھے۔ دو دن ہوتے ہی گیا ہیں۔ وقت اِس قدر کم تھا کہ طے کیا گیا کہ کم و بیش جہاں تک ہو سکے سونے سے احتراز کیا جائے اور شب و روز ساتھ رہا جائے۔ چنانچہ اکثر احباب فیضؔ سمیت اڑتالیس گھنٹے نہیں سوئے اور شعر و شاعری کی نان اسٹاپ محفل چلتی رہی۔ فیضؔ پرسوں واپس چلے گئے تو یار لوگ اب سو کر کسر پوری کر رہے ہیں۔ بہر حال فیضؔ کے کلام سے "فیض یاب" ہونے کے لیے کئی راتوں کے لیے جاگا جا سکتا ہے۔ ایسے موقعے روز روز کہاں ملتے ہیں۔"

یہ اڑتالیس گھنٹے جاگنا صرف فیضؔ کے کلام کی وجہ نہیں ہو سکتی۔ بلکہ فیضؔ صاحب سے جو ذاتی مراسم تھے۔ وہ انھیں سونے نہیں دیتے تھے۔ جہاں تک کلام کا تعلق ہے وہ تو کتابوں کی صورت میں چھپا ہوا موجود ہی تھا۔

قارئین ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں بڑی اونچی رائے رکھتے ہیں اور یہ لوگ اپنی چھوٹی موٹی خامیوں کے باوجود واقعی ہوتے بھی قابلِ پرستش ہیں۔ (بشرطیکہ سچا فن کار ہو) لیکن یہ لوگ کس طرح جیتے ہیں؟ ان کے مسائل کیا ہیں؟ یہ سب نہیں جانتے۔ ان کے سینوں میں ایک تو مخلوقِ خدا کے دکھ ہوتے ہیں۔ اُن پہ مستزاد ذاتی دُکھ۔ جب تک معاشرے میں ناہمواری ہے۔ ناانصافی ہے۔ دکھ درد ہے۔ یہ لوگ سولی پہ ہی لٹکے رہیں گے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ادیب لوگ اپنی ذاتی ذمہ داریوں کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ میں اِس بات کو نہیں مانتا۔ وہ ادیب ہی نہیں جسے اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہ ہو۔ اسی ضمن میں کرشن چندر کے ایک اور خط کی طرف لوٹتا ہوں:۔

"میں ایک ماہ کے لیے دہلی جارہا ہوں۔ ممکن ہے وہاں اس سے زیادہ عرصے کے لیے رہنا پڑ جائے۔ دراصل میری بچّی جو گزشتہ چھ سال سے علیل چلی آتی ہے۔ میرے لیے شدید ترین اور تکلیف دہ مسئلہ بن چکی ہے۔ ان دنوں یکایک اس کی ذہنی حالت اس قدر مخدوش ہوگئی ہے کہ میں پرسوں اسے لے کر دہلی جارہا ہوں۔ جہاں امریکہ سے اس مرض کے علاج کے لیے ایک نئے ماہر آئے ہیں۔ علاج کراکے دیکھوں گا۔ کچھ چھ سال میں اتنے علاج کرائے ہیں اور اتنا پیسہ پھونکا ہے کہ اب دل میں کسی طرح کی امید باقی نہیں رہی اور ذہن پر تلخی سی بھی چھانے لگی ہے۔ بہرحال کوشش کرنا انسان کا فرض ہے"

اس خط کے ملنے کے کچھ عرصہ بعد، میں پٹنہ گیا تھا۔ شکیلہ آپا نے مجھے بتایا کہ پچھلے دنوں کرشن یہاں آئے تھے اور اپنی پاگل بچّی کو بھی ساتھ لائے تھے۔ ان کی جوان بچّی پاگل ہوگئی ہے۔ جسے انھوں نے رانچی کے پاگل خانے میں داخل کرادیا ہے۔ خود کرشن چندر کا بھی بہت بُرا حال تھا۔ بے حد پریشان تھے۔ مجھے تو خطرہ نظر آرہا ہے کہ کہیں بیٹی کے بعد، باپ بھی پاگل نہ ہوجائے"

کرشن چندر نے مجھ سے شکایت کی کہ پاکستان میں میری کتابیں میری اجازت کے بغیر چھپ رہی ہیں اور ستم بالائے ستم یہ کہ دوسرے لوگ اوٹ پٹانگ قسم کی کتابیں لکھ کر میرے نام سے چھپوا رہے ہیں۔ یہ چیز میرے لیے حد درجہ تکلیف دہ ہے۔ اس لیے کہ وہ تحریریں نہایت واہیات ہیں۔ نہ فنی طور سے کام کی ہیں اور نہ ہی ان کی زبان درست ہے۔ جن لوگوں کو اس دھاندلی کا علم نہیں وہ تو مجھے کوسیں گے کہ کیا تھرڈ کلاس کتاب لکھی ہے۔ انھیں کیا پتہ کہ کرشن چندر کے نام سے کوئی عبدالسلام یا عبدالصمد لکھ رہا ہے۔

میں نے کہا۔ جناب!! اس کا علاج یہ ہے کہ پاکستان میں کسی کو اپنی کتابوں کے حقوق دے دیں۔ تاکہ وہ آپ کے حقوق کی نگرانی کر سکے۔ اس کے لیے تیار ہو گئے۔ مگر اشاعت فروش کے ہاں جا کر معاہدہ لکھنا اور پھر اُس کے لیے پاکستان ہائی کمشنر کی منظوری حاصل کرنا۔ ان کے لیے سوہانِ روح بنا رہا۔ معلوم ہوا موصوف حد درجہ کے کاہل ہیں۔

انھوں نے مجھ سے اپنی کتابوں کا معاہدہ بھی کیا تھا۔ معاہدے روز ہوتے ہیں۔ مگر ہمارا معاہدہ اور معاہدوں سے قطعاً مختلف ہے۔

اشاعتی اداروں کے متعلق مصنفین کی رائے یہ ہے کہ وہ مصنف کے ساتھ بے ایمانی کرتے ہیں۔ یہ بات صد فی صد سچی نہ ہو مگر اس میں کچھ حقیقت ضرور ہو گی۔ اس لیے میں نے ان سے شرارتاً کہا۔ ہمیں یا تو کتابوں کے حقوق

دے دیجیے یا پھر ایک شرط یہ بھی رکھیں کہ ادارۂ فروغِ اُردو کو بے ایمانی کرنے کا پورا حق حاصل ہو گا۔ اس پر بہت ہنسے اور معاہدہ لکھتے وقت، اور شرائط کے ساتھ یہ شرط بھی لکھ دی کہ میری کتابوں کے سلسلے میں ادارہ فروغِ اردو کو بے ایمانی کرنے کا بھی پورا حق حاصل ہو گا — ہے نا دلچسپ معاہدہ؟

انھیں اپنی موجودہ بیوی سے بے اندازہ محبت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن میں خوبیاں ہی خوبیاں ہیں۔ صورت کے اعتبار سے بھی، تعلیم کے اعتبار سے بھی، اخلاق کے اعتبار سے بھی۔

جن دنوں میں بھابی سے دلّی میں ملا تھا۔ انھی دنوں یہ اپنے میکے چلی گئی تھیں۔ کہہ کے یہ گئی تھیں۔ "دو ایک روز میں واپس آ جاؤں گی۔" مگر انھیں وہاں زیادہ دن لگ گئے۔

ایک صبح جو میں کرشن کے ہاں پہنچا تو بجائے کسی نوکر کے کرشن خود ہی بھاگے ہوئے آئے۔ حلیہ یہ تھا کہ پاؤں سے ننگے، صرف پاجامہ اور بنیان پہنے ہوئے۔ مجھے دیکھتے ہی کھسیانے سے ہو کر کہنے لگے۔ آئیے آئیے۔ میں تاڑ گیا کہ یہ جو اس حلیے میں اور اس والہانہ انداز میں بھاگے ہوئے آئے ہیں تو یہ گھبراہٹ میرے لیے نہیں ہو سکتی۔ میں نے ذرا سوچ کر کہا۔ "اس وقت بھابی آنے والی تھیں کیا؟"

"ہاں یار! اسی وقت ٹرین آتی ہے۔ میں سمجھا کہ وہ آ گئی ہیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ ان کی زندگی میں بناوٹ کو بہت کم دخل ہے ۔ کوئی فنکارانہ اتراہٹ نہیں ۔ باتوں میں انکسار ہے ۔ بڑے متواضع ہیں۔ (کبھی خوبصورت بھی ہوں گے؟) اور اس کے ساتھ خود بے حد شرمیلے !

لوگ کہتے ہیں کہ یہ خدائی بُتوں کے بڑے اعلیٰ درجے کے پُجاری ہیں۔ مگر مجھے اس کا کوئی علم نہیں۔ اگر یہ بات سچی بھی ہو تو مجھے ان کی زندگی کی اس خوش سلیقگی پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ مگر یہ باتیں اُس وقت کی ہوں گی جب یہ کرشن چندر ایم۔ اے ہوں گے ۔ اب تو یہ غریب صرف کرشن چندر ہیں ۔ جیسے سارے بل نکل چکے ہوں۔

جس دن مجھے لاہور واپس آنا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ بھابی اور کرشن چندر تشریف لا رہے ہیں۔ اور ان کے ہاتھ میں گاجر کے حلوے کا ڈبہ ہے ۔

صاحب

ابھی تک تو آپ ایک ایڈیٹر کی حیثیت سے ایک مصیبت بنے ہوئے تھے - اب مصنف بن کر تو آپ اور قیامت ہو جائیں گے - سچ کہتا ہوں - ''صاحب'' پڑھ کر رشک آیا - ایسی سادگی اور پُر کاری آپ کے قلم میں کہاں سے آئی - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برسوں کا کہنہ مشق جادو جگا رہا ہے -

سید احتشام حسین

میرے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ تم سلیقہ شعار ناشر اور ہنرمند مدیر ہی نہیں بلکہ ایک بلند پایہ ادیب اور نثرنگار بھی ہو (اور دل کہتا ہے کہ آئندہ شاعری پر بھی ہاتھ صاف کرو گے) ''صاحب'' کا ایک ایک جملہ موتیوں میں تولنے کے قابل ہے -

اثر لکھنوی

جناب

طفیل صاحب کی یہ کتاب معنوی حیثیت سے ایک قسم کی THREE DIMENTIONAL STUDY ہے - جس میں طول و عرض تو دوسروں کا ہے اور عمق خود ان کا ، مطالعہ کی حیثیت سے یہ ایک ایسا تجربہ ہے - جس سے لطف اٹھانا یا عبرت حاصل کرنا دوسروں پر چھوڑ دیا گیا ہے -

نیاز فتحپوری

لکڑیوں کے اس گٹھے میں جس کا نام ''جناب'' ہے - ہر طرح کی لکڑی ہے - موٹی اور پتلی بھی ، نئی اور پرانی بھی ، گیلی اور سوکھی بھی ، مگر ادیبوں کا یہ پشتارہ ہے بے حد دلچسپ ، صفحہ اول سے لے کر آخر تک یہ کاغذی زنبیل گونا گوں جادو رنگ کیفیتوں سے معمور ہے اور ان میں ہر لکڑی جلتی ہے کوئی پطرس کی طرح پٹاخے چلاتی ہے تو کوئی مرزا ادیب کی طرح رک رک کر جلتی ہے - کوئی شکیلہ اختر کی طرح ایک ہی رنگ میں جلتی چلی جاتی ہے تو کوئی مجاز کی طرح راکھ ہو چکی ہے -

کرشن چندر

- طفیل صاحب تصویر کشی کے قائل نہیں - بعض اوقات ایک ہی جھلک سے انہوں نے ایکس رے کا کام بھی لیا ہے - ان کے زیادہ تر اسکیچ اسی قسم کے ہیں - ان کی مخصوص بے تکلفی ، ہلکی میٹھی ظرافت معصوم شوخی ، اپنائیت اور بے باکی نے تمام شخصیتوں کو پڑھنے والوں سے قریب تر کر دیا ہے -

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ